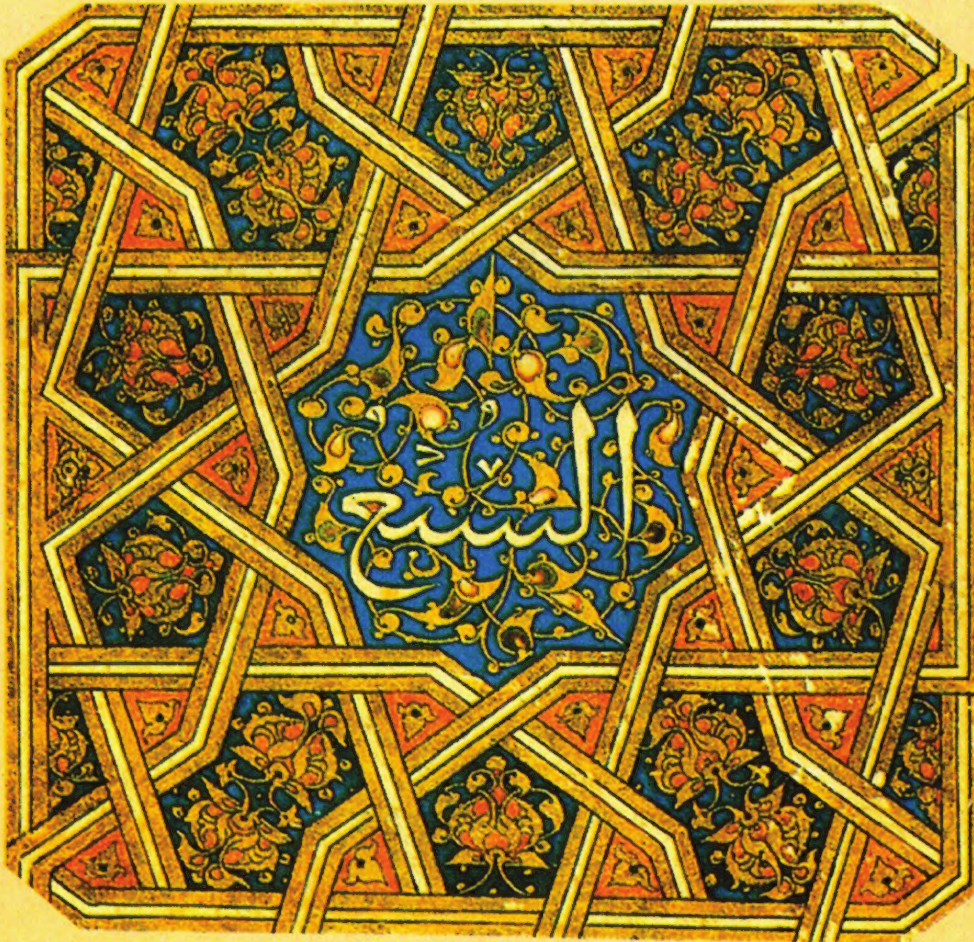
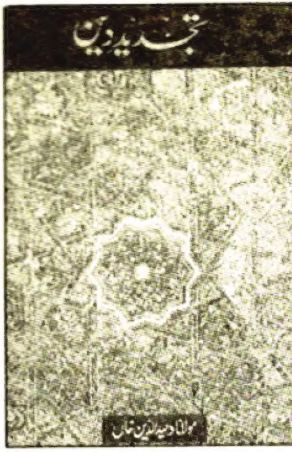
الرسالہ

Al-Risāla

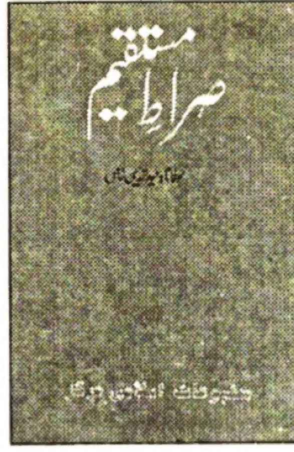
August 1997 • No. 249 • Rs. 8

جہاں معیاری حل ممکن نہ ہو وہاں عملی حل پر راضی ہوجانا
دانش مندی کی سب سے زیادہ یقینی پہچان ہے

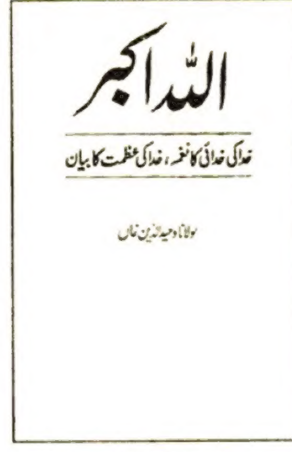




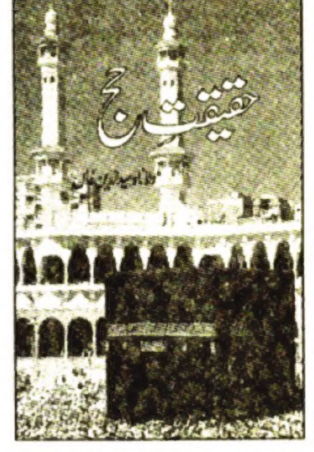
Size 22×14.5cm,
88 pages
Rs. 25



Size 22×14.5cm,
200 pages
Rs. 40



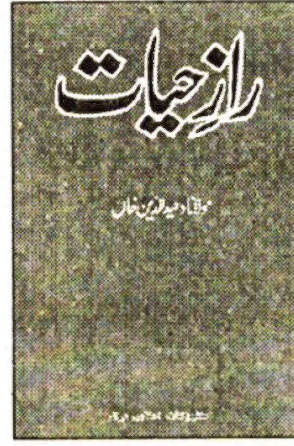
Size 22×14.5cm,
288 pages
Rs. 45



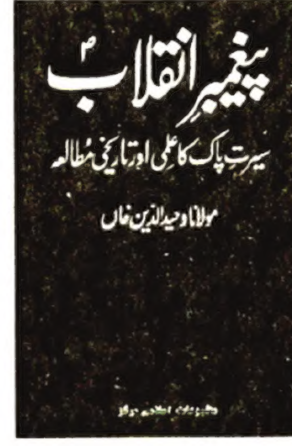
Size 22×14.5cm,
116 pages
Rs. 30



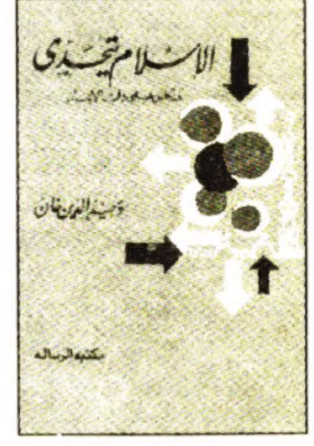
Size 22×14.5cm,
96 pages
Rs. 20



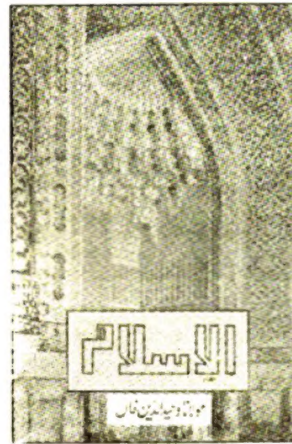
Size 22×14.5cm,
292 pages
Rs. 50



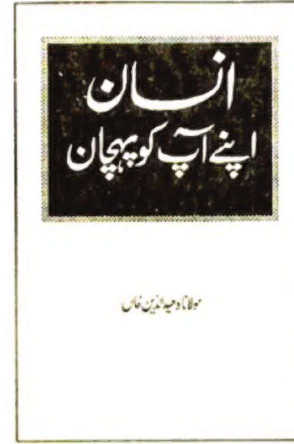
Size 22×14.5cm,
208 pages
Rs. 40



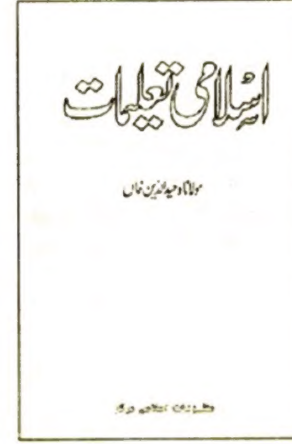
Size 22×14.5cm,
264 pages
Rs. 85



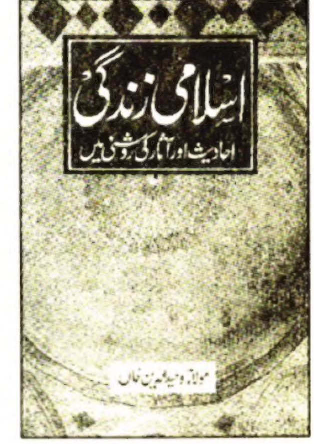
Size 22×14.5cm,
176 pages
Rs. 45



Size 22×14.5cm,
24 pages
Rs. 5



Size 22×14.5cm,
144 pages
Rs. 25



Size 22×14.5cm,
160 pages
Rs. 30

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ
Al-Risala

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market, Near DESU,
New Delhi-110013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 91-11-4697333
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 8
One year Rs. 90. Two years Rs. 170.
Three years Rs. 250. Five years Rs. 400
Abroad: One year $ 20/£10 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577

DISTRIBUTED IN USA BY
MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-2583435

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

اگست ۱۹۹۷ ، شمارہ ۲۴۹

فہرست — صفحہ

زیر طبع کتابیں

تصویرِ ملت

دعوتِ اسلام

سفرنامہ: غیر ملکی اسفار (جلد دوم)

حکمتِ قرآن

قرآن ۲۳ سال میں نجماً نجماً (تدریجی طور پر) اترا۔ اس اسلوب نزول کی حکمت بتاتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے : ولا تعجل بالقرآن من قبل ان یقضی الیک وحیہ وقل رب زدنی علما (طٰہٰ ۱۱۴) اور تم قرآن کے لینے میں جلدی نہ کرو جب تک اس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے اور کہو کہ اے میرے رب، میرا علم زیادہ کر دے۔

مکہ میں قرآن کے ذریعہ جو دعوتی مہم چل رہی تھی، اس میں بار بار لوگوں کی طرف سے نئے نئے سوالات اٹھائے جاتے تھے۔ اور ان مسائل کا حل دریافت کیا جاتا تھا جن کی بابت قرآن میں ابھی کچھ نہیں اترا تھا۔ مثلاً مشرکین کی زیادتیوں کے بارہ میں قرآن میں یہ حکم اترا تھا کہ ان پر صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کرو۔ اب ان کا شکار ہونے والے مسلمان یہ کہتے تھے کہ ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم ان سے لڑکر اس کا خاتمہ کریں۔ ایسی حالت میں مخلص اہلِ ایمان فطری طور پر یہ چاہتے تھے کہ قرآن کا وقفۂ نزول کم ہو تاکہ بقیہ معاملات میں بھی جلد از جلد خدا کی رہنمائی مل جائے۔ جزئی احکام والے قرآن کے بجائے مکمل احکام والا قرآن ہمیں حاصل ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قرآن جس ترتیب و تدریج سے اتر رہا ہے وہ اتفاقی نہیں ہے بلکہ وہ خدا کا طے شدہ منصوبہ ہے۔ قرآن اسی طرح اسی اسلوب میں اترتا رہے گا یہاں تک کہ فطری طور پر وہ اپنی تکمیل تک پہنچ جائے۔

اہل ایمان کو اس سے روکا گیا کہ وہ مستقبل میں اترنے والے قرآن (یا احکام قرآن) کو حال میں اتارنے کے خواہش مند نہ ہوں۔ اس کے بجائے تمہیں یہ دعا کرنی چاہیے کہ اللہ تمہارے فہم قرآن میں اضافہ کر دے۔ قرآن کی اگلی آیتوں کے بارہ میں تعجیل کے بجائے تمہیں اس حکمت کو جاننے کی کوشش کرنا چاہیے کہ قرآنی احکام کے نزول میں تدریج کیوں رکھی گئی ہے۔

مصلح کے لیے جائز نہیں کہ وہ جلد باز بنے۔ دعوت کے حالات میں لوگوں کو جہاد پر اکسانا، تعمیرِ فکر کے دور میں اجتماعی اقدام کا حکم سنانا، جن مواقع پر صبر و اعراض مطلوب ہے وہاں قتال کی آیتوں کے حوالے دینا، یہ سب اسی کے ذیل میں داخل ہے۔

انسان کی قسمیں

انسان کی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو اپنے آپ کو برائیوں سے بچائے۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو اگرچہ خود تو برائیوں میں ملوث ہوں مگر وہ ان لوگوں کی قدر کریں جو برائی سے دور رہتے ہیں۔ تیسری قسم وہ ہے جب کہ برائی کرنے والا نہ صرف برائی کرے بلکہ وہ اچھے لوگوں کا دشمن بن جائے۔ ہر شخص کو اپنا احتساب کرکے دیکھنا چاہیے کہ وہ ان تینوں میں سے کس قسم سے تعلق رکھتا ہے۔

خدا نے ہر عورت اور مرد کو آزاد پیدا کیا ہے۔ تاہم یہ آزادی حق کے طور پر نہیں بلکہ آزمائش کے طور پر ہے۔ خدا کے مطلوب بندے صرف وہ ہیں جو اپنی آزادی کا غلط استعمال نہ کریں۔ یہی لوگ ہیں جو موت کے بعد جنت میں داخل کیے جائیں گے۔

دوسرے لوگ وہ ہیں جو اپنے آپ کو کنٹرول میں نہ رکھ سکیں۔ اور برائیوں میں ملوث ہو جائیں۔ تاہم ان کی فطرت اس حد تک زندہ ہو کہ جب وہ کوئی برا کام کریں تو اس پر وہ شرمندگی محسوس کرتے ہوں۔ اسی کے ساتھ وہ اچھے لوگوں کی قدر کریں۔ ان کا سر اچھے لوگوں کے آگے جھک جاتا ہو۔ یہ لوگ بھی اگرچہ برے ہیں لیکن ان کی شرمندگی اور نیک لوگوں کے لیے ان کی قدردانی، یہ ان کی ایسی صفت ہے جو شاید خدائے رحمٰن و رحیم کے سامنے ان کی سفارش بن سکے۔

تیسری قسم ان عورتوں اور مردوں کی ہے جن کا حال یہ ہو کہ وہ برائیوں میں اس طرح ملوث ہوں کہ ان کا سینہ بے حسی کا کارخانہ بن جائے۔ وہ برائی کرتے کرتے اس حد تک بے حس ہو چکے ہوں کہ نیک لوگ ان کے لیے قابل نفرت چیز بن جائیں۔ نیک لوگوں کو بدنام کرنا، ان کو ذلیل کرنا، ان کی ترقی کو روکنا، ان کے مفادات کو مجروح کرنا، یہ ان کا شیوہ بن جائے۔

ایسے لوگ خدا کی نظر میں بدترین جانور ہیں۔ خدا انھیں کبھی معاف کرنے والا نہیں، اِلّا یہ کہ وہ توبہ کریں اور اپنی روش سے باز آئیں۔

غیر جانب دارانہ سوچ

۷ مارچ ۱۹۹۷ کو جناب شمشاد محمد خاں صاحب لندن سے دہلی آئے۔ ملاقات کے وقت انھوں نے بتایا کہ ان کا یہ سفر برٹش ایرویز کے جہاز سے تھا۔ جہاز کے ایک ہندستانی مسافر نے ان سے کہا کہ یہ انگریز لوگ آج بھی ہم ہندستانیوں سے امتیازی سلوک کرتے ہیں۔ دیکھئے، میں نیویارک سے آرہا ہوں۔ نیویارک سے لندن تک کا سفر میں نے برٹش ایرویز سے کیا تھا، اب لندن سے دہلی کا سفر بھی برٹش ایرویز سے کر رہا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ نیویارک سے لندن کے لیے جو جہاز تھا اس میں سیٹوں کے درمیان جگہ (leg space) زیادہ تھی۔ اور بھی بہتر سہولتیں اس کے اندر موجود تھیں۔ لیکن لندن سے دہلی کے لیے ہم جس جہاز سے سفر کر رہے ہیں اس میں یہ سہولتیں موجود نہیں۔ یہ کتنا بڑا امتیاز (discrimination) ہے۔

شمشاد محمد خاں صاحب نے مذکورہ ہندستانی مسافر سے کہا کہ بھائی صاحب، یہ امتیازی سلوک کی بات نہیں ہے۔ یہ کامپٹیشن کی بات ہے۔ ٹرانس اٹلانٹک راستہ پر بہت سی کمپنیاں پروازیں کرتی ہیں۔ وہاں نہایت سخت مقابلہ ہے۔ کمپنیاں مسافروں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے ایک دوسرے کے مقابلہ میں بہتر سہولت فراہم کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہیں۔ مگر لندن اور دہلی کے راستہ پر ایسا کامپٹیشن نہیں۔ اس لیے یہاں کوئی کمپنی اتنا زیادہ توجہ بھی نہیں دیتی۔ یہ فرق برٹش ایرویز ہی میں نہیں خود ایرانڈیا میں بھی موجود ہے جو ہندستان کی اپنی کمپنی ہے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر غلط فہمیاں کس طرح جنم لیتی ہیں۔ اس کا سبب بیشتر حالات میں یہ ہوتا ہے کہ ایک واقعہ کو جس معاملہ سے جوڑنا چاہیے اس کے بجائے اس کو کسی اور معاملہ سے جوڑ لینا۔

واقعات کو صحیح رخ سے دیکھئے۔ کوئی معاملہ سامنے آئے تو اس کو اصل سبب سے جوڑئیے۔ محض ظاہری طور پر رائے قائم کرنے کے بجائے گہرائی میں اتر کر اپنی رائے بنائیے۔ متاثر ذہن سے سوچنے کے بجائے غیر جانب دارانہ طور پر سوچئے۔ اگر آپ ایسا کریں تو اس کے بعد آپ کو کسی سے نہ شکایت ہوگی اور نہ غلط فہمی۔

شیطان کا خطرہ

قرآن کی سورہ نمبر، میں ارشاد ہوا ہے کہ —— اے بنی آدم، ہم نے تم پر لباس اتارا، جو تمہارے بدن کے قابلِ شرم حصوں کو ڈھانکے اور زینت بھی۔ اور تقویٰ کا لباس اس سے بھی بہتر ہے۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔ تاکہ لوگ غور کریں۔ اے آدم کی اولاد، شیطان تم کو بہکا نہ دے جس طرح اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکلوا دیا، اس نے ان کے لباس اتروائے، تاکہ ان کو ان کے سامنے بے پردہ کردے۔ وہ اور اس کے ساتھی تم کو ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انھیں نہیں دیکھتے۔ ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کا دوست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے (الاعراف ۲۶ - ۲۷)

خدا نے انسان کو لباس دیا جو اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اور اس کے ساتھ اس کے حسن و وقار کو بڑھانے کا ذریعہ بھی ہے۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ آدمی کے روحانی وجود کے لیے بھی اسی طرح ایک لباس ضروری ہے۔ یہ لباس تقویٰ ہے۔ تقویٰ آدمی کا معنوی لباس ہے۔ جو اس کو ایک طرف شیطان کے حملوں سے بچاتا ہے۔ اور دوسری طرف اس کے باطن کو سنوار کر اس کو جنت کی لطیف و نفیس دنیا میں بسانے کے قابل بناتا ہے۔ یہ تقویٰ کا لباس کیا ہے۔ یہ ہے —— اللہ کا خوف، حق کا اعتراف، اپنے لیے اور دوسروں کے لیے ایک معیار رکھنا، اپنے کو بندہ سمجھنا، تواضع کو اپنا شعار بنانا، دنیا میں گُم ہونے کے بجائے آخرت کی طرف متوجہ رہنا۔ آدمی جب ان چیزوں کو اپنائے تو وہ اپنے اندرونی وجود کو ملبوس کرتا ہے۔ اور وہ اگر اس کے خلاف رویہ اختیار کرے تو وہ اپنے اندرون کو ننگا کر لیتا ہے۔ ظاہری جسم کو کپڑے کا بنا ہوا لباس ڈھانکتا ہے۔ اور باطنی جسم کو تقویٰ کا لباس۔

آدمی کو گمراہ کرنے کے لیے شیطان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اس کو بہکاتا ہے۔ وہ خدا کے ممنوعہ درخت کو ہر قسم کے خیر کا سرچشمہ بتاتا ہے۔ وہ ایسے معصوم راستوں سے اس کی طرف آتا ہے کہ آدمی کا گمان بھی نہیں جاتا کہ ادھر سے اس کی طرف گمراہی آرہی ہوگی۔ شیطان آدمی کے تمام نازک مقامات کو جانتا ہے۔ اور انھی نازک مقامات سے وہ اس پر حملہ آور ہوتا ہے۔ تاہم شیطان صرف ان لوگوں کے مقابلہ میں کامیاب ہوتا ہے جو اس کے لیے اپنے تمام دروازے کھول دیں۔

برتر تدبیر

حضرت ابراھیم بن عیلہ کو خلیفہ ہشام بن عبد الملک اموی نے بلایا اور ان کو مصر کے محکمۂ
ٔراج کے افسر کا عہدہ پیش کیا۔ حضرت ابراھیم بن عیلہ نے عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور
ہا کہ میں اس کا اہل نہیں ہوں۔

خلیفہ ہشام کو غصہ آگیا۔ اس نے کہا کہ آپ کو یہ عہدہ قبول کرنا ہوگا ورنہ آپ کو سخت سزا
ی جائے گی۔ حضرت ابراھیم بن عیلہ نے نہایت نرمی کے ساتھ کہا "اللہ تعالیٰ نے قرآن میں
رمایا ہے کہ ہم نے زمین و آسمان کو امانت پیش کی مگر انھوں نے اس کو اٹھانے سے انکار
ر دیا۔ پھر جب خدائے بزرگ و برتر ذمہ داری قبول نہ کرنے پر خفا نہیں ہوئے تو آپ کیوں مجھ پر
فا ہو رہے ہیں"۔ خلیفہ ہشام بن عبد الملک یہ سن کر چپ ہوگیا اور ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

ابراھیم بن عیلہ کے مذکورہ جواب سے پہلے خلیفہ ہشام کو غلطی ابراھیم بن عیلہ کی طرف نظر
رہی تھی، اس جواب کے بعد خلیفہ کو محسوس ہوا کہ غلطی خود اس کی اپنی طرف ہے۔ اس احساس
نے اس کی سوچ کو بدل دیا اور اس نے اپنے متشددانہ حکم کو واپس لے لیا۔

یہ ایک عظیم الشان فطری ہتھیار ہے جو اللہ تعالےٰ نے ہر آدمی کے لیے اور ہر آدمی کے
لاف مہیا کیا ہے، خواہ اس کا حریف بادشاہ وقت ہی کیوں نہ ہو۔

آدمی اگر ردعمل کی نفسیات میں مبتلا نہ ہو۔ وہ تیز و تند الفاظ بول کر یا مخالفانہ کارروائی کر کے
حاملہ کو مزید نہ بگاڑے تو یقینی طور پر وہ اس امکان کو اپنے حق میں استعمال کر سکتا ہے۔ آدمی کو
یاہیے کہ جب بھی اپنے خلاف کوئی صورت حال پیش آئے، وہ ٹھنڈے ذہن سے سوچ کر
ارروائی کرے۔ وہ فریق ثانی کے اندر احساس خطا کو جگانے کی کوشش کرے۔ اگر فریق ثانی
کے اندر احساس خطا بیدار ہوگیا تو گویا وہ خود ہی اپنے ہتھیاروں سے زخمی ہوگیا۔

فریق ثانی کے اندر چھپی ہوئی فطرت کو جگانا اس کے اوپر سب سے بڑا حملہ ہے۔ کوئی بھی شخص نہیں
و اس حملہ کی تاب لا سکے۔ تاہم یہ حملہ وہ لوگ کر سکتے ہیں جو اپنے آپ کو ردعمل کی نفسیات سے مکمل طور پر
الی کر لیں۔ جو لوگ اشتعال کی بات پر مشتعل ہو جائیں وہ کبھی اس اعلیٰ تدبیر کو استعمال نہیں کر سکتے۔

اصلاحی مداخلت

قرآن کی اٹھارویں سورہ میں موسیٰؑ اور خضرؑ کا قصہ بیان ہوا ہے۔ خضر غالباً کوئی فرشتہ تھے جو حضرت موسیٰ کی تعلیم کے لیے انسان کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ دونوں نے غالباً مصر اور سوڈان کے درمیانی علاقہ میں ایک لمبا سفر کیا۔ اس سفر کے دوران حضرت خضرؑ نے تین خاص واقعات کیے۔

ان میں سے ایک واقعہ یہ تھا کہ دونوں ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ راستہ میں خضر نے اس کشتی کو پھاڑ دیا (الکہف ۷۱) حضرت موسیٰؑ نے متعجب ہو کر اس کا سبب پوچھا تو حضرت خضرؑ نے جواب دیا: کشتی کا معاملہ یہ ہے کہ وہ چند مسکینوں کی تھی جو دریا میں محنت کرتے تھے۔ تو میں نے چاہا کہ اس کو عیب دار کر دوں۔ اور ان کے آگے ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی چھین کر لے لیتا تھا (الکہف ۷۹)

اس واقعہ کی مختلف تفصیلات حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں آئی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ غریب آدمی پانی میں کشتی چلانے کا پیشہ کرتے تھے۔ یہی ان کی معاش کا ذریعہ تھا۔ جس علاقہ میں وہ کشتی چلاتے تھے، وہاں کے بادشاہ کو کوئی جنگی مہم پیش آگئی۔ اس نے حکم جاری کر دیا کہ ہنگامی ضرورت کے تحت اس علاقے میں چلنے والی تمام اچھی کشتیوں کو ضبط کر لیا جائے۔ حضرت خضرؑ کو اس کا علم تھا۔ انھوں نے یہ کیا کہ کشتی جب مذکورہ علاقہ کے قریب پہنچی تو انھوں نے اس کا ایک تختہ نکال کر اس کو عیب دار بنا دیا تاکہ بادشاہ کے کارندے جب اس کشتی کو دیکھیں تو اس کو ناقص سمجھ کر چھوڑ دیں۔ بعد کو یا تو حضرت خضرؑ نے یا خود کشتی کے مالکوں نے کشتی کو مرمت کر کے اس کو درست کر لیا۔

اس واقعہ سے نظام قدرت کا ایک پہلو معلوم ہوتا ہے۔ دنیا میں انسان کو اگرچہ آزادی دی گئی ہے۔ مگر خدا کے حکم سے خدا کے فرشتے برابر اس کی نگرانی کرتے رہتے ہیں۔ جہاں وہ دیکھتے ہیں کہ مقاصد تخلیق فوت ہو رہے ہیں وہاں وہ مداخلت کر کے معاملات کو از سر نو صحیح رخ پر لگا دیتے ہیں۔ تاہم یہ پورا کام اسباب کے پردہ میں انجام دیا جاتا ہے تاکہ امتحان کا ماحول باقی رہے۔ جو لوگ اس راز کو نہیں سمجھتے وہ اس کو نظام فطرت کا نقص کہنے لگتے ہیں۔ حالاں کہ اس قسم کے انتہائی واقعات کی اصل حیثیت اصلاحی مداخلت کی ہوتی ہے، وہ نظام فطرت میں کسی خرابی کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ دنیا میں انسان کو آزادی دی گئی ہے، مگر اسی کے ساتھ اس کے اوپر خدا کی نگرانی بھی قائم ہے۔

اقتدار کے باوجود

لارڈ ایکٹن (Lord J.E.E.D. Acton) ۱۸۳۴ میں نیپلس میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۲ میں ٹیگنرنسی میں ان کی وفات ہوئی جو اب ویسٹ جرمنی میں واقع ہے۔ تاریخ اور فلسفہ میں انھوں نے شہرت حاصل کی۔ ان کا ایک قول ہے کہ اقتدار آدمی کو بگاڑتا ہے اور کامل اقتدار بالکل ہی بگاڑ دیتا ہے۔ اس سے زیادہ گمراہی کی کوئی بات نہیں کہ یہ کہا جائے کہ اقتدار کا منصب آدمی کو پاک باز بناتا ہے :

> Power tends to corrupt, and absolute power corrupts absolutely. There is no worse heresy than that the office sanctifies the holder of it.

لارڈ ایکٹن تاریخ اور نفسیات کے بہت بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں، مگر وہ صرف دنیادار اور سیکولر لوگوں کی تاریخ سے واقف تھے۔ ان کو اس تاریخ کی خبر نہیں تھی جو ان مقدس ہستیوں نے بنائی ہے جن کو اللہ کی سچی معرفت حاصل ہوئی اور جو آخرت کی فکر میں زندگی گزارنے والے تھے۔

اس معاملہ میں انسانوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک سیکولر انسان، اور دوسرے متقی انسان۔ سیکولر انسان کے لیے حکومتی منصب ایک اعزاز ہوتا ہے۔ اقتدار کا عہدہ پاکر وہ خوش ہوتا ہے کہ اس کو اپنے آپ کو نمایاں کرنے کا موقع حاصل ہوا۔ یہ چیز اس کے اندر فخر و ناز کی نفسیات پیدا کرتی ہے اور فخر و ناز یا تکبر کی نفسیات ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔

اس کے برعکس متقی انسان کو جب اقتدار ملتا ہے تو وہ اس کو ذمہ داری کا ایک منصب سمجھتا ہے۔ وہ اس اندیشہ میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ موت کے بعد مجھے اللہ تعالیٰ کے یہاں حساب دینا ہوگا کہ میں نے اقتدار کے منصب کو کس طرح استعمال کیا۔ یہ تصور اس کے اندر تواضع اور جواب دہی کا احساس جگا دیتا ہے۔ اور جس آدمی کے اندر تواضع اور جواب دہی کی کیفیت پیدا ہو جائے وہ اقتدار کے منصب پر پہنچ کر اور زیادہ محتاط بن جاتا ہے ——— اسلام کے دور اول کے حکمراں اس کی نہایت اعلیٰ مثال ہیں۔ اقتدار کے منصب کو پاکر وہ ذرا بھی نہیں بہکے۔ اس کے برعکس وہ اور زیادہ سنبھل گئے۔ وہ پہلے سے زیادہ پاکباز انسان بن گئے۔

زمانی فرق

مکی دور کا ایک واقعہ ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے اسلام قبول کیا تو ایک روز وہ کعبہ میں گئے اور انھوں نے اسلامی طریقہ کے مطابق نماز پڑھنا شروع کیا۔ مکہ کے مشرکین نے ان کو کعبہ میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو وہ دوڑ کر آئے اور ان کے اوپر ٹوٹ پڑے۔ انھوں نے ان کو بری طرح مارا پیٹا حتی کہ یہ ممکن نہ رہا کہ وہ وہاں اپنی نماز کو پورا کر سکیں۔

۱۹ اکتوبر ۱۹۹۶ کو راقم الحروف کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا جس کو یہاں میں بلا تقابل درج کر رہا ہوں۔ اس دن بمبئی میں چوپاٹی کے مقام پر ایک بہت بڑا جلسہ تھا۔ اس کو سوادھیائے تحریک والوں نے منظم کیا تھا۔ چوپاٹی کے میدان میں تقریباً دس لاکھ ہندو حضرات اکٹھا تھے۔ ایک سرے پر بہت اونچا اور بہت وسیع منچ بنایا گیا تھا جس پر مسٹر ایل کے اڈوانی اور دوسرے بہت سے بڑے بڑے ہندو لیڈر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں بھی مقرر کے طور پر وہاں مدعو تھا۔

اس دوران مغرب کا وقت ہو گیا۔ میں نے منچ کے ایک طرف کھڑے ہو کر سب کے سامنے مغرب کی نماز ادا کی۔ اس وقت سوادھیائے تحریک کے چیرمین دادا جی پانڈورنگ شاستری کی تقریر ہو رہی تھی۔ انھوں نے اپنی تقریر روکی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے پرنام کیا۔

ان دونوں واقعات میں یہ فرق کیوں ہے۔ دور اول کے واقعہ میں غیر مسلموں نے ایک مسلمان کو نماز پڑھنے نہیں دیا تھا۔ آج خود غیر مسلموں کے بڑے مجمع میں ایک مسلمان آزادی کے ساتھ نماز ادا کرتا ہے۔ اس فرق کا سبب زمانے کی تبدیلی ہے۔ قدیم زمانے میں مذہبی جبر کا نظام قائم تھا۔ اور موجودہ زمانہ مذہبی آزادی کا زمانہ ہے۔ اس بنا پر آج مذہب کے حق میں ایسے امکانات کھل گئے ہیں جو کبھی پائے نہیں جاتے تھے۔

پہلے تشدد کے ماحول میں مذہب پر عمل کیا جا سکتا تھا۔ آج امن کے ماحول میں مذہب پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ پہلے آزادانہ طور پر مذہبی سرگرمیاں جاری نہیں کی جا سکتی تھیں، آج یہ ممکن ہو گیا ہے کہ کامل آزادی کے ساتھ مذہبی سرگرمیوں کو جاری کیا جائے۔

ترتیب وتدریج

صحیح البخاری (کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن) میں حضرت عائشہ رض کی ایک روایت ہے۔ وہ بتاتی ہیں کہ اسلام میں پہلے جنّت و جہنم والی آیتیں اتریں۔ جب لوگوں کے اندر قبولیت کا مادہ پیدا ہوگیا تو اس کے بعد حرام و حلال کے احکام اترے۔ اگر شروع ہی میں یہ حکم اترتا کہ شراب چھوڑ دو اور زنا چھوڑ دو تو یقیناً لوگ کہتے کہ ہم تو کبھی شراب نہیں چھوڑیں گے، ہم کبھی زنا نہیں چھوڑیں گے (لقالوا لاندع الخمر ابداً ولاندع الزنا ابداً) فتح الباری ۸/۶۵۵

احکام کو جاری کرنے کی یہ ترتیب صرف دور اول کے لیے نہیں ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ ترتیب و تدریج صرف ابتدائی دور کے لیے تھی جب کہ قرآن اتر رہا تھا، اب جبکہ قرآن پورا اتر چکا تو اب وہ بیک وقت پورا نافذ بھی کیا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ احکام کے اجراء اور نفاذ کا تعلق معاشرہ کی ایمانی اور اخلاقی حالت سے ہے۔ جب بھی لوگوں میں ایمانی اور اخلاقی کمزوری پائی جائے گی تو دوبارہ وہی ترتیب مطلوب ہو جائے گی جو دور اول میں مطلوب تھی

مورخین اسلام نے خلیفۂ عادل حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے بارہ میں لکھا ہے کہ خلیفہ ہو جانے کے باوجود انھوں نے سارے شرعی احکام بیک بار نافذ نہیں کیے۔ ان کے نوجوان صاحبزادہ عبد الملک نے ایک دن کہا کہ کیا وجہ ہے کہ آپ تمام شرعی احکام کو نافذ نہیں کر رہے ہیں۔ اب آپ اس قوم کے خلیفہ ہیں، تمام شرعی احکام کو نافذ کر کے آپ موجودہ تمام ظلم و فساد کو ختم کر دیجیے۔ خلیفہ عمر بن عبد العزیز نے جواب دیا:

لاتعجل یابنی، فإن اللہ ذم الخمر فی القرآن مرتین وحرمها فی الثالثة۔ وانی اخاف ان احمل الحق علی الناس جملة فیدفعونه جملة ویکون من ذا فتنة۔

(المجلة ۱۸-۲۴ فروری ۱۹۹۶، صفحہ ۳۵)

اے میرے بیٹے، جلدی نہ کرو۔ کیوں کہ اللہ نے شراب کی دو بار مذمت کی اور پھر تیسری بار اس کو حرام کیا۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں حق کو بیک وقت لوگوں کے اوپر لاد دوں تو وہ اس کو بیک وقت اتار پھینکیں گے۔ اور پھر ایک نیا فتنہ پیدا ہو جائے گا۔

عمر بن عبد العزیز کے اس جواب پر ان کے صاحبزادہ عبد الملک نے یہ نہیں کہا کہ یہ تو اس وقت کی بات ہے جب کہ قرآن اتر رہا تھا۔ اب جب کہ پورا قرآن نازل ہو چکا ہے تو اب بعد کے زمانہ کے لیے یہ ترتیب نہیں ہے۔ اب ہمارے پاس مکمل شریعت ہے، اور اب ہمارے اوپر لازم ہے کہ ہم سیاسی طاقت کو استعمال کر کے پوری شریعت کو مکمل طور پر نافذ کر دیں۔ اب ہم اس کے حصے بخرے نہیں کر سکتے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے نزول کی ترتیب ہی ابدی طور پر اس کے نفاذ کی ترتیب بھی ہے۔ اگلی نسلوں میں ہمیں دوبارہ یہ دیکھنا ہے کہ لوگوں کی ایمانی طاقت کیا ہے۔ لوگوں کی قبولیت کا کیا حال ہے۔ سماجی اور سیاسی حالات کیسے ہیں۔ اور پھر حقیقی صورت حال کا جائزہ لے کر اس کے مطابق تدریجی طور پر شرعی احکام کو نافذ کرنا ہے۔

اسی کا نام اسلامی حکمت ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ نظری اور عملی پہلوؤں میں فرق کیا جائے۔ اسلام کے عملی احکام کو بالترتیب اتنا ہی نافذ کیا جائے جتنا کہ لوگوں کے اندر قبولیت کا مادہ پایا جا رہا ہے، اور بقیہ اجزاء شریعت کے سلسلے میں ترغیب و تبلیغ کی مہم جاری رکھی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ قوانین کے نفاذ کا معاملہ ۵۰ فی صد حکومت سے تعلق رکھتا ہے، اور بقیہ ۵۰ فی صد زیر نفاذ انسانوں سے۔ کوئی قانون کسی معاشرہ میں اسی وقت نافذ ہوتا ہے جب کہ خود معاشرہ کے اندر اس کے حق میں ایک درجہ کی آمادگی پیدا ہو چکی ہو۔ معاشرہ میں موافق فضا پیدا کیے بغیر اس کے اندر قانون کا نفاذ اتنا ہی ناممکن ہے جتنا کہ زمین تیار کیے بغیر اس سے ہری بھری فصل حاصل کرنا۔

گوہاٹی کا سفر

گوہاٹی (آسام) میں ۳ - ۶ جنوری ۱۹۹۵ کو ایک نیشنل سیمینار ہوا۔ اس کی دعوت پر گوہاٹی کا سفر ہوا۔ اس سیمینار کا موضوع تھا — نارتھ ایسٹ انڈیا اور اکیسویں صدی:

North-east India and the 21st century.

آج گوہاٹی کے لئے روانگی کا دن تھا۔ میں تیاری میں مصروف تھا۔ دو صاحبان ملاقات کے لئے آگئے۔ دونوں پڑھے لکھے اور دیندار مسلمان تھے۔ دونوں نے کہا کہ ہم کو آپ کے مشن سے اختلاف ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا اختلاف ہے۔ ایک نے کہا کہ آپ ہمارے اکابر پر تنقید کرتے ہیں۔ دوسرے نے کہا کہ آپ ہندوؤں کے مقابلہ میں صبر کرنے کے لئے کہتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ اس وقت میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں آپ دونوں سے صرف ایک بات کہتا ہوں۔ آج رات کو جب آپ بستر پر سونے کے لئے جائیں تو یہ سوچیں کہ کل اگر آپ کی موت ہو جائے اور خدا آپ سے پوچھے کہ تم الرسالہ مشن کے مخالف کیوں بن گئے تھے۔ تو کیا آپ کا یہ جواب وہاں کام آئے گا کہ ہم اس لئے مخالف ہو گئے کہ یہ شخص ان لوگوں پر تنقید کرتا تھا جس کو ہم نے بطور خود اکابر کا درجہ دے رکھا تھا۔ اور وہ ہندوؤں سے صبر کرنے کے لئے کہتا تھا جن کو ہم اپنا قومی دشمن بنائے ہوئے تھے۔

جنوری ۱۹۹۵ کی دو تاریخ ہے اور صبح ساڑھے گیارہ بجے کا وقت۔ میں دہلی ایرپورٹ پر گوہاٹی جانے والے جہاز کے انتظار میں بیٹھا ہوں۔ نشست گاہ میں نسبتاً کم آدمی نظر آرہے ہیں۔ تاہم تقریباً ہر آدمی کے ہاتھ میں آج کا اخبار ہے۔ اخبار کیا ہے۔ خارجی دنیا کا خبرنامہ۔ میں نے سوچا: ہر آدمی دوسروں کا خبرنامہ پڑھ رہا ہے۔ خود اپنا خبرنامہ پڑھنے کا شوق کسی کو نہیں۔

کچھ دیر میں گیٹ پر روشن حروف میں یہ الفاظ نمایاں ہو گئے (Now Boarding—889)

یہ اس بات کا خاموش اعلان تھا کہ گوہاٹی جانے والا جہاز روانگی کے لئے تیار ہے۔ مسافر ایک ایک کر کے گیٹ سے گزر کر انڈین ایرلائنز کی فلائٹ ۸۸۹ میں داخل ہو گئے۔

جہاز کسی قدر تاخیر کے ساتھ روانہ ہوا۔ دہلی سے گوہاٹی کے لئے یہ سوا دو گھنٹہ کی نان

اسٹاپ فلائٹ تھی۔ ایئر پورٹ پر یہ اعلان کیا گیا تھا کہ جہاز ٹھیک وقت سے گوہاٹی کے لئے روانہ ہوگا۔ مگر جب تمام مسافر جہاز کے اندر بیٹھ گئے تو معلوم ہوا کہ کچھ ٹکنکل سبب کے تحت جہاز لیٹ ہے۔ چنانچہ ۴۵ منٹ کی تاخیر کے ساتھ جہاز پونے ایک بجے روانہ ہوا۔

میں نے سوچا کہ ہندستان میں آدمی خواہ ہوائی جہاز سے سفر کرے یا ٹرین کے ذریعہ، ہر جگہ ناقابل قیاس مسائل ہیں۔ کل دہلی ریلوے اسٹیشن پر ایک ناقابل ذکر واقعہ پیش آیا۔ ہمارے دفتر کے ایک کارکن نصیر احمد صاحب کے بوڑھے والد اپنے بیٹے سے مل کر واپس اپنے وطن یوپی جارہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک نیا سوٹ کیس تھا جس میں کچھ نئے کپڑے اور کھانے کا سامان تھا۔ بزرگ پلیٹ فارم پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے بیٹے سیٹ دیکھنے کے لئے گاڑی میں گئے تھے۔ اتنے میں ایک آدمی آیا۔ اس نے کہا: بڑے میاں چلئے آپ کو گاڑی میں بٹھا دیں۔ یہ کہہ کر فوراً اس نے بیگ اٹھایا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ بڑے میاں کہتے رہے کہ میرے ساتھ میرا لڑکا ہے۔ مجھے ضرورت نہیں۔ مگر وہ آدمی تیزی سے بیگ لے کر غائب ہوگیا۔

اس قسم کے جرائم ہر روز ہر بستی اور ہر شہر میں ہورہے ہیں۔ ان کے مسلسل جاری رہنے کا واحد سبب یہ ہے کہ مجرمین کو یہ اطمینان رہتا ہے کہ انھیں کوئی سزا ملنے والی نہیں۔ اگر انھیں یقین ہو کہ جرم کرنے پر مجھے کوڑ امارا جائے گا، میرا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا، مجھے گولی مار دی جائے گی، تو جرائم اپنے آپ ختم ہو جائیں۔

پرواز کے دوران ۲ جنوری کے اخبارات ہندو، بزنس لائن، دی آبزرور پڑھا۔ مگر ان میں کوئی قابل ذکر بات نہیں ملی۔ ہندستان کے اخبارات پر سیاسی ذوق اتنا زیادہ چھایا ہوا ہے کہ میرے جیسے آدمی کو کوئی کام کی بات مشکل ہی سے ملتی ہے۔ مغربی ملکوں میں ایسا نہیں ہے۔ مگر وہاں بھی صرف یہ فرق ہوا ہے کہ اخباروں کے صفحات پر سیاست کی جگہ تجارت نے قبضہ کرلیا ہے۔

انڈین ایئر لائنز کی فلائٹ میگزین سواگت کا شمارہ جنوری ۱۹۹۵ دیکھا۔ اس میں ایک مضمون ہندستان کی سیاحت پر تھا جو مارک نکلس (Mark Nicholls) کے قلم سے تھا۔ وہ بذریعہ ٹرین مختلف مقامات کا سفر کرتا ہوا آگرہ پہنچتا ہے۔ وہاں وہ تاج محل کو دیکھتا ہے۔ تاج محل کو وہ عجوبۂ عالم (Wonder of the World) قرار دیتا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اگر کسی ایک بلڈنگ کو انڈیا

کی علامتی تصویر بتانا ہو تو وہ ممتاز محل کا مقبرہ (تاج محل) ہے:

If one building was to sum up an image of India it is the tomb of Mumtaz Mahal. (p. 74)

لوگ تاج محل کو غیر معمولی اہمیت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مگر تقریباً ۲۵ سال پہلے جب میں پہلی بار آگرہ گیا اور تاج محل کو دیکھا تو مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوئی۔ میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر قریب کی مسجد میں چلا گیا۔

۲ جنوری کی سہ پہر کو ۳ بجے جہاز گوہاٹی ایرپورٹ پر اتر گیا۔ یہاں ایرپورٹ کے لاؤنج میں تھوڑی دیر کے لئے بیٹھنا پڑا۔ یہاں ایک معمر بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ یہ پروفیسر بی کے رائے برمن تھے۔ وہ دہلی میں رہتے ہیں (Tel. 641194) انھوں نے بتایا کہ انھوں نے اسلام اور مسلمانوں پر کئی کتابیں انگریزی میں لکھی ہیں۔ ان کی دو کتابوں کے نام یہ ہیں:

Prism in Islam
Muharram in two cities
by B.K. Roy Burman
1779, C.R. Park, New Delhi

میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ مختصر طور پر بتائیں گے کہ آپ کے مطالعہ کے مطابق اسلام کی اسپرٹ کیا ہے۔ انھوں نے حسب ذیل الفاظ میں اپنا تاثر بیان کیا:

Human brotherhood, man's basic nature is in quest of his humane essence, social justice.

پروفیسر رائے برمن نے کثرت سے ملک کے مختلف حصوں کا سفر کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندستان مختلف اور متضاد کلچروں کا ملک ہے۔ انھوں نے بتایا کہ گوہاٹی سے ۶۰ کیلومیٹر کے فاصلہ پر ایک مندر ہے۔ وہاں سال میں ایک دن باجماعت نماز ہوتی ہے۔ اسی طرح انھوں نے بتایا کہ بھوٹان کی سرحد پر ایک قبیلہ ہے۔ وہ اپنے دیوتا کو خوش کرنے کے لئے سال میں ایک دن گائے کی قربانی کرتا ہے۔ اس طرح کی مختلف باتیں انھوں نے بتائیں۔

ایرپورٹ سے ہوٹل کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ تقریباً پون گھنٹہ کا راستہ تھا۔ راستہ

میں سڑک کے دونوں طرف گوہاٹی کے مناظر سامنے سے گزرتے رہے۔ ہر چیز پر پسماندگی کے آثار دکھائی دئے۔ یہاں کے مکانات، یہاں کی دکانیں، یہاں کے مرد اور عورت، سب کچھ کم سے دکھائی دئے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ہر چیز پر پسماندگی کی اسٹیمپ لگی ہوئی ہے۔ (Miniature)

ایک آدمی جب دہلی کو دیکھتا ہے تو وہ اس کو پرعظمت شہر دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بعد جب وہ گوہاٹی کو دیکھتا ہے تو گوہاٹی اس کو مقابلۃً نمبر ۲ کا شہر معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہ فرق اس کے اندر وہ احساس جگاتا ہے جس کو "علیحدگی پسندی" کہا جاتا ہے۔ ہندستان کی یہی نامساوی ترقی یہاں کی سیاسی بے چینی کی اصل ذمہ دار ہے۔ اس کے برعکس آپ امریکہ میں جائیں یا یورپ کے کسی ترقی یافتہ ملک کا سفر کریں تو وہاں بڑے شہر اور چھوٹے شہر میں اس قسم کا فرق آپ کو نہیں ملے گا۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں ہمارے ملک جیسی علیحدگی کی تحریکیں بھی ابھرنے نہیں پاتیں۔

گوہاٹی میں میرا قیام اشوک گروپ کے ہوٹل برھم پترا کے کمرہ ۳۰۱ میں تھا۔ ہوٹل کے کمرہ میں پشت کی طرف "شیشہ کی دیوار" کے باہر سبزہ اور درخت کے مناظر ہیں۔ اس کے بعد جھیل ہے جس کا پانی دور تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے اوپر چڑیوں کے جھنڈ اڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جھیل کے اس پار سبز پوش پہاڑ کھڑے ہوئے ہیں۔

یہ مناظر بتاتے ہیں کہ یہ علاقہ قدرتی وسائل سے بھرا ہوا ہے۔ خاص طور پر یہاں پانی کی افراط ہے جس سے زراعت اور باغبانی کو بہت ترقی دی جاسکتی ہے۔ نیز، سستی بجلی بڑی مقدار میں پیدا کی جاسکتی ہے۔ اس کے باوجود یہ علاقہ پسماندہ پڑا ہوا ہے۔ ایک ریٹائرڈ افسر نے بتایا کہ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ حکومت نے اس علاقہ کی مدد نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ مرکزی حکومت نے اس علاقہ کو بے پناہ مالی مدد بھیجی ہے۔ مگر اس مدد کا بڑا حصہ تھوڑے سے لوگوں کی جیب میں چلا گیا۔ اس کا بہت کم حصہ ڈیولپمنٹ کے کاموں میں استعمال ہوا۔ ہندستان میں آپ جس مسئلہ کی تحقیق کریں، آخر میں سب کی جڑ میں یہی کرپشن نظر آئے گا۔

اس صورت حال کی بنا پر اب میرا حال یہ ہے کہ حکومت جب "ڈولپمنٹ" کے نام پر کسی بڑی رقم کا اعلان کرتی ہے تو میری روح کانپ اٹھتی ہے کہ عوامی ٹیکسوں پر لوٹ کی ایک نئی مد کھل گئی۔

۲ جنوری کی شام کو میں اپنے کمرہ میں تھا کہ داخلی ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ رسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے آواز آئی کہ جسٹس بھاگوتی آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد ان سے گفتگو ہوئی۔ وہ بھی سیمنار میں آئے ہوئے ہیں اور اسی ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ ضرور تشریف لائیں۔ چند منٹ کے بعد وہ کمرہ میں آگئے۔

جسٹس پی این بھاگوتی (سابق چیف جسٹس آف انڈیا) انٹرنیشنل شہرت کے آدمی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہاں سے واپسی کے بعد میں اریٹریا جا رہا ہوں۔ وہاں کی حکومت نے اپنے دستور کا ڈرافٹ تیار کرنے کے لئے مجھے بلایا ہے۔ وہاں سے واپسی کے بعد میں دہلی میں آپ سے تفصیلی ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ گفتگو کے بعد ۱۵ جنوری کی تاریخ طے ہوئی۔ میں نے تجویز کیا کہ دہلی میں کچھ معروف افراد پر مشتمل ایک حلقہ بنایا جائے۔ اس کی ماہانہ میٹنگ ہوا کرے۔ دوسرے کاموں کے علاوہ اس کا ایک خاص کام یہ ہو کہ پیش آمدہ اشوز پر وہ تبادلہ خیال کے بعد ایک اسٹیٹمنٹ تیار کرے اور فوری طور پر اس کو اخبارات میں شائع کرایا جائے۔ انھوں نے اس سے مکمل اتفاق کیا۔ اور کہا کہ میں سفر سے واپسی کے بعد ۱۵ جنوری تک آپ سے ملوں گا اور اس تجویز کو عملی شکل دینے کے لئے گفتگو کروں گا۔

آج شام کو مغرب کی نماز ہوٹل کے کمرہ میں پڑھی۔ نماز کے بعد ہاتھ اٹھایا تو یہ دعا زبان سے نکلی: اللھم ادخلنی مدخل صدق و اخرجنی مخرج صدق و اجعل لی من لدنك سلطاناً نصیراً

۲ جنوری کی شام کو ۸ بجے ایک ہال میں تفریحی پروگرام تھا۔ لوگ اس کو دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے۔ میں رنج و غم میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے قرآن کی آیت (الجمعہ ۱۱) یاد آئی۔ میں نے سوچا کہ آج کی دنیا میں آدھے انسان لہو میں مبتلا ہیں۔ اور آدھے انسان تجارت میں۔ ذکر خداوندی میں مشغول ہونے والا انسان کہیں دکھائی نہیں دیتا۔

اس سے واپسی میں مسٹر چترنجن ڈیب سے ملاقات ہوئی۔ وہ اگرتلا کے رہنے والے ہیں۔ ۱۹۴۶ میں جب گاندھی جی نواکھالی گئے تھے تو وہ وہاں جا کر گاندھی جی سے ملے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ اس وقت میری عمر ۱۶ سال تھی۔ میں نے گاندھی جی کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا تو گاندھی جی

ہنس پڑے۔ یہ ہنسی غضب کی تھی۔ وہ آدمی کو مسحور کر دینے والی تھی۔ اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ سرونسٹن چرچل نے کیوں اپنے لڑکے سے کہا تھا کہ اس ننگے فقیر سے (naked Fakir) **مت ملنا**۔ اس کی ہنسی تم کو کھا جائے گی۔

اشوک ہوٹل میں مولانا اسعد مدنی کے صاحبزادہ جناب محمود اسعد مدنی (۲۸ سال) سے ملاقات ہوئی۔ وہ بزنس کے سلسلہ میں یہاں آئے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ جب میں دار العلوم میں تعلیم حاصل کر رہا تھا، اس وقت سے میرے اندر تجارت کا جذبہ پیدا ہوا۔ لوگوں سے سنتا تھا کہ چندہ لے کر کھا گئے تو میں نے طے کیا کہ میں بزنس کروں گا۔ چنانچہ انھوں نے لکڑی کی تجارت شروع کی ہے۔ ٹیک کی لکڑی وہ آسام سے خرید کر لے جاتے ہیں اور لکھنؤ میں ہول سیل میں اس کو فروخت کرتے ہیں۔

میں نے کہا کہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ عام طور پر علماء کے خاندان کے لوگ مدرسہ اور چندہ کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ آپ نے اس کے بجائے تجارت کا کام شروع کر کے ایک مثال قائم کی ہے۔

مولانا محمود اسعد مدنی سے میں نے کہا کہ میں گوہاٹی کے کچھ مسلمانوں سے ملنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے کچھ مقامی مسلمانوں سے ربط قائم کیا۔ چنانچہ ۵ جنوری کو نماز مغرب کے بعد کچھ لوگ آ گئے۔ ہوٹل کے کمرہ میں نشست ہوئی۔ ان میں جمیل الدین احمد صاحب، رقیب الحسین صاحب آصف احمد صاحب، علی رضا صاحب، غلام اکبر صاحب وغیرہ موجود تھے۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کی اس نشست میں گوہاٹی اور آسام کے مسلمانوں کے بارہ میں گفتگو ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ آسام میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۳۰ فیصد ہے اور گوہاٹی میں تقریباً پندرہ فیصد۔ گوہاٹی شہر میں تقریباً ایک سو مسجدیں ہیں۔ بہت سے مدرسے قائم ہیں۔ ایک بڑا مدرسہ جس میں دورۂ حدیث تک کی تعلیم ہوتی ہے۔ تاہم پورے آسام میں مسلمانوں کا کوئی اخبار موجود نہیں۔ روایتی طور پر آسام میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات بہت اچھے رہے ہیں۔ مگر ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد یہاں کے کچھ مسلمانوں نے انتہائی نادانی سے کام لیتے ہوئے اجودھیا کا غصہ آسام میں اتارنا چاہا۔ اس کے نتیجہ میں تعلقات میں کچھ بگاڑ آ گیا۔

۳ جنوری کی صبح کو ناشتہ کی میز پر کئی آدمیوں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں سے ایک مسٹر روندر کیلیکر (Ravindra Kelekar) ہیں۔ ان کی عمر ۷۰ سال ہے اور وہ گوا کے رہنے والے ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ اپنی زندگی کا کوئی خاص واقعہ بتائیے۔

انھوں نے ۱۹۵۳ کا ایک واقعہ بتایا۔ اس وقت وہ واردھا (سیوا گرام) میں تھے۔ وہاں سے گجراتی زبان میں ایک پرچہ نکلتا تھا جس کا نام منگل پربھات تھا۔ اس پر اڈیٹر کی حیثیت سے کا کا صاحب کالیلکر کا نام ہوتا تھا۔ مگر عملاً اس کو روبندر کیلیکر ہی مرتب کرتے تھے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ انھوں نے سنسکرت کا ایک اشلوک گجراتی میں نقل کیا تو سنسکرت میں زیادہ واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے اس کو انھوں نے غلط طور پر لکھ دیا تھا۔ لوگوں نے کا کا صاحب کالیلکر کو توجہ دلائی تو انھوں نے روندر کیلیکر کو ایک خط لکھا تھا کہ تم سنسکرت کے اشلوک غلط لکھتے ہو، اس طرح تو میری بدنامی ہو جائے گی۔ اس کے جواب میں روندر کیلیکر نے انھیں لکھا کہ اس کا حل یہ ہے کہ پرچہ میں میرا نام ورکنگ اڈیٹر کے طور پر لکھ دیا جائے۔ اس طرح اس قسم کی غلطیاں میرے خانہ میں چلی جائیں گی۔ اور آپ کی بدنامی نہیں ہوگی۔

کا کا صاحب کالیلکر (وفات ۱۹۸۱) نے جواب میں لکھا کہ ایسا کرنا تمہارے حق میں اچھا نہیں ہے۔ جب تک تم تیاری کے مرحلہ میں ہو تب تک تمہاری غلطیاں مجھے لینا چاہئے۔ اس وقت تم کو بدنامی سے بچانا زیادہ ضروری ہے تاکہ تمہارا صحافتی مستقبل خراب نہ ہونے پائے۔

۳ جنوری کو سمینار کا افتتاح تھا۔ ہم لوگ ہوٹل سے رابندر بھون لے جائے گئے۔ گیٹ کے اندر داخل ہوئے تو دو درجن کی تعداد میں ناگا لوگ استقبال کے لئے موجود تھے۔ وہ اپنے روایتی لباس میں تھے۔ روایتی انداز کا نیم برہنہ لباس ان کے جسم پر تھا۔ ہاتھوں میں بلم لئے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنی زبان میں ایک گانا گایا جو سمجھ میں نہ آسکا۔ اس کے بعد مہمانوں کو دونوں طرف سے اپنے جلو میں لے کر اندر ہال میں لے گئے۔ یہاں دوبارہ وہ لوگ اسٹیج کے پیچھے اپنے روایتی اسلحہ کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔

مسٹر ٹھور ٹھکر جو اسی علاقہ کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ یہ ناگا لوگ ہیں۔ ان کا کلچر جنگ پر مبنی ہے۔ ان کا پورا کلچر وار کلچر ہے۔ آج کی تقریب میں انھوں نے فتح کا منظر دکھایا تھا، جیسے

کہ ہم نے اس شہر کو فتح کیا ہے۔ اور اب فتح کی تقریب منانے کے لئے ہم اس ہال میں آئے ہیں اور فوجی دستے ہمارے ساتھ ہیں۔

مسٹر نٹور تھکر نے اپنے ویلکم ایڈریس میں کہا کہ جواہر لال نہرو کہتے تھے کہ ہم سب چھوٹے لوگ ہیں جو ایک بڑے کام میں مشغول ہیں:

We all are small men engaged in great mission.

میں نے سوچا کہ یہ بات تو بڑی اچھی ہے۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ سو سالہ محنت کے باوجود ہماری کوششوں کا رزلٹ کیوں نہیں نکل رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملک الٹی جانب سفر کر رہا ہو۔

جسٹس پی این بھاگوتی نے اپنے افتتاحی ایڈرس میں دہرایا کہ نہرو نے کہا تھا کہ اپنی کامیابی کو جانچنا ہو تو ملک کے سب سے چھوٹے آدمی کو دیکھو:

...see the smallest man of India.

یہ سیمینار ناگالینڈ گاندھی آشرم کے زیر انتظام منعقد کیا گیا تھا۔ سابق چیف جسٹس آف انڈیا پی این بھاگوتی نے اس کا افتتاح کیا۔ اپنے افتتاحی خطاب میں انھوں نے کہا کہ اس علاقہ میں علیحدگی کا جو طاقتور رجحان پایا جاتا ہے، اس کا واحد حل یہ ہے کہ مرکز کا اقتدار اسٹیٹ کے اوپر سے کم کیا جائے۔ غیر مرکزی نظام ہی اس کا واحد حل ہے:

the only solution is decentralisation of power.

چند اور تقریریں ہوئیں۔ مقامی انگلش اخبار کے اڈیٹر ڈاکٹر بیزبورہ (D.N. Bezboruah) نے کہا کہ اکیسویں صدی میں ہمارے ملک میں کوئی معجزہ ہونے والا نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں کا آدمی صرف اپنے حقوق کو جانتا ہے۔ اس کو ملک کے بارہ میں اپنی ذمہ داریوں کا پتہ نہیں:

No miracle was going to happen in the 21st century in the country. This was due to our obsession with our rights rather than duties to our country.

افتتاحی اجلاس ۳ جنوری کو رابندر بھون میں ہوا تھا۔ بقیہ تمام اجلاس ہوٹل برہم پتر

اشوک کے ہال میں ہوئے۔ مقررین نے بہت سی باتیں کہیں۔ ساری باتیں نقل کرنا ممکن نہیں ہے۔ چند باتیں متفرق طور پر یہاں درج کی جاتی ہیں:

ایک صاحب نے گاندھی جی کا یہ قول دہرایا کہ "سارے مذہب اچھے ہیں، سارے مذہب سچے ہیں، مگر سارے مذہب کچے ہیں"۔ یہ بات کہنے میں بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ مگر وہ غیر منطقی ہے۔ سچائی کو آدمی اس لئے اختیار کرتا ہے تاکہ وہ اعتقادی یقین حاصل کرسکے۔ مگر مذکورہ فارمولا آدمی کو ہمیشہ کے لئے یقین سے محروم کر دیتا ہے۔ ایسا فارمولا تلاش حق کے جذبہ کے مطابق نہیں۔ اس لئے وہ صحیح بھی نہیں ہوسکتا۔

ایک صاحب نے کہا کہ جو لوگ انگریزی زبان کو ختم کرنے کی بات کرتے ہیں ان کو جاننا چاہئے کہ موجودہ حالات میں وہ ممکن نہیں۔ لوگ انگریزی زبان کی طرف کیوں جاتے ہیں۔ وہ تین باتوں کے لئے ایسا کرتے ہیں —— پاور، رسپکٹ، جاب۔ یہ تینوں باتیں جب تک آپ ملکی زبان میں پیدا نہ کرسکیں، انگریزی کی طرف دوڑ بھی ختم ہونے والی نہیں۔

مسٹر دوارکا شرما نے بتایا کہ منیرورم میں ایک نوجوان سے انھوں نے پوچھا کہ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ نوجوان نے جواب دیا کہ ہم انڈیا سے الگ ہونا چاہتے ہیں۔ انھوں نے دوبارہ پوچھا کہ کیوں۔ نوجوان نے جواب دیا کہ وہ ہمارے ساتھ برابر کا سلوک نہیں کرتے:

They are not treating us as equal.

ایک صاحب نے کہا کہ ان نوجوانوں میں گھومنے کے بعد میں سمجھا ہوں کہ ان کے نزدیک پرامن ذرائع کا وقت اب ختم ہوچکا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اب وہ ہتھیار کے سوا کوئی اور بات سننے کے لئے تیار نہیں۔ نوجوان مایوس ہیں، اور یہی اصل مسئلہ ہے:

Youths are disillusioned, this is the problem.

۳ جنوری کو دوپہر بعد کے سیشن میں ہیومن رائٹس کے مسئلہ پر غور ہوا۔ یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ اس علاقہ میں عوام کے اندر جو بے چینی ہے اس کی وجہ کیا یہ ہے کہ ان کے حقوق انسانی کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں دو قسم کی باتیں سامنے آئیں۔ میری رائے یہ تھی کہ اصل مسئلہ بے شعوری کا ہے نہ کہ حقوق انسانی کی خلاف ورزی کا۔

۴ جنوری کو تیسرا اجلاس ساڑھے نو بجے صبح شروع ہوا۔ آج بھی حقوق انسانی کا مسئلہ دوبارہ زیر بحث آیا۔ سرکاری افسروں کا خیال تھا کہ گورنمنٹ بہت کام (tremendous work) کر رہی ہے۔ تحفظ حقوق کا قانون (Protection of human rights act) بنایا گیا ہے۔ ہیومن رائٹس کمیشن بنایا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں کام کرنے والی غیر سرکاری تنظیموں کا نیشنل رجسٹر بنایا گیا۔ کمیشن کے نام چار ہزار شکایتیں حقوق انسانی کی خلاف ورزی کی وصول ہوئیں۔ وغیرہ۔

ایک اہم مثال یہ ہے کہ کمیشن نے تجویز کیا کہ ٹاڈا پر نظر ثانی کی جائے۔ اسی طرح جیل کا معائنہ کر کے تجویز کیا کہ قیدیوں کی حالت کو بہتر بنایا جائے۔ مثلاً جیل میں جگہ کی تنگی (over crowding in jails) وغیرہ۔

میں نے کہا کہ حقوق انسانی کے جو واقعات اخباروں میں چھپتے ہیں وہی مجالس میں زیر بحث آتے ہیں۔ حالانکہ وہ کل ہونے والے واقعات کا بمشکل ۵ فیصد حصہ ہوتا ہے۔

۳ جنوری کی شام کو میں پروگرام سے فارغ ہو کر ہوٹل واپس آ رہا تھا۔ گاڑی میں میرے علاوہ دو اور صاحبان تھے۔ دونوں دو الگ الگ یونیورسٹیوں کے پروفیسر تھے۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا: آپ کی یونیورسٹی میں کوئی پرابلم تو نہیں۔ انھوں نے ہنستے ہوئے جواب دیا کہ جس یونیورسٹی میں پرابلم نہ ہو وہ یونیورسٹی ہی نہیں:

University minus of problems is not a university.

یہ حال اب ہمارے ملک میں تعلیمی اداروں کا ہو چکا ہے۔ اب تعلیمی اداروں میں تعلیم سے زیادہ سیاست کی سرگرمیاں ہوتی ہیں۔ سیاسی سرگرمیوں کے لئے جو اشو استعمال کئے جاتے ہیں انھیں کا نام پرابلم ہے۔ ہماری تعلیم گاہوں کا یہ حال کیوں ہے۔ اس کا سبب بہت پیچھے تک جاتا ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے کے زمانہ میں تعلیم گاہوں میں سیاست داخل کی گئی تاکہ آزادی کی تحریک کے حق میں نوجوانوں کی تائید حاصل کی جا سکے۔ ۱۹۴۷ کے بعد دوبارہ یہ سیاست جاری رکھی گئی کیونکہ نئے حکمرانوں کو الکشن میں ووٹ حاصل کرنے کے لئے طلبہ کی مدد کی ضرورت تھی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر کار تعلیمی ادارے تعلیم سے زیادہ سیاست بازی کا مرکز بن گئے۔
اس علاقہ کی سات ریاستوں میں تعلیم کی حالت کیا ہے، اس کا اندازہ ذیل کے نقشہ سے ہوگا:

Percentage of literacy to total population 1981 & 1991

States	1981			1991		
	Average	Male	Female	Average	Male	Female
Arunachal Pr.	20.70	28.94	11.32	41.22	51.20	29.37
Assam	—	—	—	53.42	62.34	43.70
Manipur	41.35	53.29	29.06	60.96	72.98	48.64
Meghalaya	34.08	37.89	30.08	48.26	51.57	44.78
Mizoram	50.88	64.46	54.91	81.23	84.06	78.09
Nagaland	42.57	50.06	33.89	61.30	66.09	55.72
Tripura	42.12	51.70	32.00	60.39	70.08	50.01
India	43.56	56.37	29.75	52.11	63.86	39.42

ایک مقامی بزرگ نے بڑے دردمندانہ انداز میں اس علاقہ کے حالات بتائے۔ انھوں نے کہا کہ علیٰحدگی کی تحریک میں ہم نے اپنا سب کچھ کھو دیا، اور پایا کچھ بھی نہیں۔ نئی دہلی کے لوگوں سے کہئے کہ وہ کوئی مؤثر ڈائیلاگ شروع کریں، اور یہ ڈائیلاگ کسی پیشگی شرط (pre-condition) کے بغیر ہو۔ نارتھ ایسٹ کا یہ علاقہ جلنے کے لئے نہیں ہے:

The North-East is not for burning.

میں نے کہا کہ یہ سارا معاملہ غیر حقیقت پسندانہ انداز اختیار کرنے کی وجہ سے پیش آیا ہے۔ اور اب حقیقت پسندی کا طریقہ کر کے ہم اس کو ختم کر سکتے ہیں۔

گوہاٹی کو اگرچہ دوسرے ہندستانی شہروں کے مقابلہ میں ایک بی کلاس سٹی کا درجہ حاصل ہے۔ مگر اس کی اہمیت اس اعتبار سے بہت زیادہ ہے کہ وہ پورے نارتھ ایسٹرن علاقہ کے لئے ہندستانی دروازہ کی حیثیت رکھتا ہے:

Gauhati is the gateway to the entire north-eastern region.

نارتھ ایسٹ انڈیا کا علاقہ اپنی مخصوص جغرافی پوزیشن کی وجہ سے مرغ کی گردن

کہا جاتا ہے۔ ذیل کے نقشہ سے اس کا اندازہ ہوگا: (chicken's neck)

سیمنار میں جو کاغذات تقسیم کئے گئے ان میں کچھ معلوماتی صفحات تھے۔ ان میں سے ایک میں بتایا گیا تھا کہ ان ساتوں ریاستوں میں مذہب کے اعتبار سے آبادی کا تناسب کیا ہے، یہ اعداد وشمار اگلے صفحہ پر نیچے نقل کئے جارہے ہیں۔

واضح ہو کہ ہندستان میں اس وقت چھ بڑے مذاہب پائے جاتے ہیں۔ وہ یہ ہیں —— ہندوازم، اسلام، مسیحیت، سکھ ازم، بدھزم، جین ازم، آبادی کے اعتبار سے ان مذاہب کا تناسب یہ ہے:



(1)	Hindu	....	76.4%
(2)	Islam	....	12.6%
(3)	Christian	....	7.3%
(4)	Jaina	....	2.2%
(5)	Buddhist	....	2%
(6)	Sikh	....	2.8%

مسٹر نٹور ٹھکر مشنری انسان کا کامیاب نمونہ ہیں۔ انھوں نے نیشنل انٹگریشن کا مشن لیکر ۱۹۵۵ میں ناگا پہاڑیوں میں گاندھی آشرم بنایا۔ اس وقت سے اب تک ہر قسم کی مشکلات کے باوجود وہ اس ایک مقصد کے تحت یہاں جمے ہوئے ہیں۔ ایک ایسا علاقہ جہاں علیحدگی کی تحریک جارحانہ بنیاد پر چل رہی تھی، وہاں انھوں نے ملکی اتحاد کے لئے خاموش محنت شروع کی۔ ان پر کئی بار قاتلانہ حملے کئے گئے، مگر آج وہ ناگاؤں کے درمیان ایک محبوب شخصیت ہیں۔ انھوں نے اپنے مقصد میں قابل لحاظ کامیابی حاصل کی ہے۔

یہ کامیابی انھیں کیسے ملی۔ اس کے لئے سب سے پہلے انھوں نے یہ کیا کہ یہاں آنے کے بعد انھوں نے پوری طرح ناگا کلچر کو اختیار کرلیا۔ وہ انھیں میں کے ایک فرد بن گئے۔ وہ نہایت سخت قسم کے سبزی خور ہیں اور پورے معنوں میں گاندھی وادی ہیں۔ مگر یہاں انھوں نے دیکھا کہ گوشت ناگاؤں کی روزمرہ کی غذا ہے۔ ایسی حالت میں سبزی خوری کی عادت کو لے کر وہ ناگاؤں میں گھل مل نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنے مقصد کی خاطر گوشت خور (non-vegetarian) بن گئے۔ انھوں نے اپنا قصہ بتاتے ہوئے کہا:

Distribution of Religion in North Eastern State (in percentage)

States	Hinduism	Islam	Christ.	Sikh	Buddhists	Jains	Others
Arunachal Pr.							
Assam*	58.57	24.28	6.3	0.12	0.43	0.12	0.03
Manipur	60.04	6.99	29.6	0.06	0.03	0.06	3.15
Meghalaya	18.02	3.10	52.6	0.12	0.20	0.04	25.76
Mizoram	7.14	0.45	83.8	0.08	8.19	—	0.23
Nagaland	14.36	1.52	80.1	0.00	0.07	0.15	3.68
Tripura	89.34	6.74	1.20	0.01	2.69	0.01	0.01

*—1971 census figures for Assam

I remember trying to eat meat which tasted like rubber to me, but as a mark of respect for my religion I refused to eat beef.

مجھے یاد ہے کہ کس طرح میں گوشت کھانے کی کوشش کرتا تھا جس کا ذائقہ مجھے بالکل ربر کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ البتہ اپنے مذہب کے احترام میں گائے کا گوشت کھانے سے میں نے انکار کر دیا۔

مسٹر ٹھکر اپنے آشرم سے ایک انگریزی پرچہ اشانی (Ishani) کے نام سے نکالتے ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ سیاست اور مذہب کا دور ختم ہو گیا۔ مستقبل اب سائنس اور روحانیت کے لئے ہے:

The days of politics and religion are now over and the future belongs to science and spiritualitv

میں نے کہا کہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ سیاست کا رول اب محدود ہو گیا ہے۔ مگر سچا اور حقیقی مذہب بدستور علم اور روحانیت دونوں کے لئے گائڈ کی حیثیت رکھتا ہے۔

گوہاٹی کے سیمنار (اور اس طرح کے دوسرے سیمناروں میں جو باتیں میں نے سنیں اور مسلم اجتماعات میں جو باتیں کی جاتی ہیں، جب میں دونوں کا مقابلہ کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں کوئی مناسبت نہیں۔ اس طرح کے سیمناروں میں ہمیشہ ملکی مسائل زیر بحث آتے ہیں۔ مثلاً گوہاٹی کے سیمنار میں ساری بحث دو نکتہ پر مرکوز رہی۔ اس علاقہ میں علیحدگی پسندی کے رجحان کو کس طرح ختم کیا جائے۔ اس علاقے کی معاشی پس ماندگی کو کس طرح دور کیا جائے۔ اس کے برعکس مسلم اجتماعات میں ساری بحث صرف مسلم کمیونٹی کے مسائل پر ہوتی ہے۔ یہ بحث بھی اس مفروضہ پر ہوتی ہے کہ مسلمان اس ملک میں تعصب اور ظلم کا شکار ہو رہے ہیں، اس کا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔

اس صورت حال نے مسلمانوں کو ملک کی مین اسٹریم سے الگ کر دیا ہے۔ وہ اس طرح زندگی گزار رہے ہیں جیسے کہ وہ کوئی الگ قوم ہیں۔ مزید یہ کہ وہ اس ملک میں ایک محروم اور مظلوم طبقہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک مسلمان بزرگ سے میں نے کہا کہ ہندستان کی قیادت کی سو سالہ سرگرمیوں کا خلاصہ یہ ہے کہ —— پہلے ہنگامہ کر کے تقسیم کرانا، اور جب تقسیم

سے ان کے مسائل حل نہ ہوئے تو اس کی ذمہ داری دوسروں پر ڈال کر دوبارہ فریاد شروع کر دینا۔

ایک صاحب نے کہا کہ اعداد و شمار پیش کر کے ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ گراس نیشنل پروڈکشن (جی این پی) میں اضافہ ہوا ہے۔ میں کہوں گا کہ اگر جی این پی بڑھا ہے تو ساتھ ہی ایک اور جی این پی بھی بڑھا ہے۔ یہ دوسرا جی این پی ہے —— گراس نیشنل پاورٹی۔

ایک صاحب نے کہا کہ نارتھ ایسٹ انڈیا کا سارا مسئلہ مصنوعی تقسیم کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اس غلطی کی تصحیح کیجئے، اور بنگلہ دیش کی سرحدوں کو ختم کر کے سارے علاقہ کو ایک جغرافی وحدت بنا دیجئے، اور پھر سارا مسئلہ اپنے آپ حل ہو جائے گا۔

بنگلہ دیش کی طرف سے روزگار کی تلاش میں جو لوگ آتے ہیں، ان کو ایک صاحب نے ناخواندہ مہمان (unwelcome guests) بتایا اور کہا کہ ان کا سلسلہ بند ہونا چاہئے۔ دوسرے صاحب نے کہا کہ اس کا تعلق "بنگلہ دیش" سے نہیں ہے۔ یہ تو تقسیم کے بہت پہلے سے رائج ہے۔ معاشی ضرورت کے تحت ساری دنیا میں لوگ اِدھر سے اُدھر جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ بھی آتے ہیں، اور پھر اکثر واپس چلے جاتے ہیں۔

گوہاٹی کے انگریزی اخبار نارتھ ایسٹ ٹائمس (The North East Times) کا شمارہ ۳ جنوری دیکھا۔ اس میں نیو گوہاٹی کے جیبون سائیکیا (Jibon Saikia) کا خط پڑھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ کانگرس کی ووٹ بنک کی پالیسی کے نتیجہ میں بنگلہ دیش سے مسلمانوں کی آمد برابر جاری ہے۔ مسلمانوں کو خوش کرنے کا یہ سلسلہ جاری رہا تو اگلے ۲۰ سال میں آسام ایک مسلم اکثریت کا علاقہ بن جائے گا:

> It has now become crystal clear that Assam is going to be a Muslim majority state in India, in the course of near about twenty years. (p. 4)

اسی کے ساتھ اخبار میں بہت سی خبریں تھیں جو بتا رہی تھیں کہ یہاں کے جرائم کی رفتار بڑھ رہی ہے۔ امپھال کے علاقہ میں پانچ کو کی مار ڈالے گئے اور تین آدمی بری طرح زخمی ہو گئے۔ جورہاٹ میں پانچ مسلم نوجوان ایک بنک میں داخل ہوئے اور دو لاکھ ۴۴ ہزار روپیہ لے کر فرار ہو گئے۔ گرام دیو گاؤں میں پندرہ ڈاکوؤں کا ایک گروہ ایک اسکول ٹیچر مہندر داس کے گھر

میں گھس گیا۔ انھوں نے گھر والوں کو مارا اور ایک ہزار روپیہ نقد اور قیمتی سامان لے کر بھاگ گئے
دو مونی میں ایک ہتھیار بند گروہ ایک بنک میں داخل ہوا اور پچاس لاکھ روپیہ لے کر بھاگ گیا۔ وغیرہ
آسام میں بنگلہ دیشیوں کی آمد کا افسانہ صحیح ہے یا غلط، اس سے قطع نظر، آج لوگوں کا حال
یہ ہے کہ ریاست اگر بالفرض مسلم اکثریت کا علاقہ بننے والی ہو تو ان کو سخت پریشانی ہو گی، لیکن
اگر ان کی ریاست جرائم اکثریت کا علاقہ بن رہا ہو تو اس کے لئے انھیں کوئی پریشانی نہیں۔ یہی
غیر حقیقت پسندانہ مزاج ہے جس نے ملک کو موجودہ تباہی کے مقام پر پہنچایا ہے۔
مسٹر چارلس چاشی (Charles Chashie) انگریزی روزنامہ ناگالینڈ آبزرور کے اڈیٹر
ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس علاقہ کی ٹریجڈی دراصل لیڈر شپ کا فقدان ہے۔ انھوں نے آر ایم
لالہ کی کتاب قیادت کی تلاش (In Search of Leadership) کا حوالہ دیا۔ مصنف نے اس میں
میک گریگر (Mac Gregor) کا قول نقل کیا ہے کہ عوام کو بہتر حالت کی طرف لے جانے کا راز
قیادت کو بہتر بنانا ہے:

That people can be lifted into their better selves is the secret of transforming leadership.

میں نے کہا کہ یہ مسئلہ صرف اس علاقہ کا نہیں ہے بلکہ پورے ملک کا اور ہر کمیونٹی کا ہے۔ مگر
اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہمارے یہاں اچھے لیڈر نہیں ہیں۔ اصل یہ ہے کہ عمومی جہالت اور بے شعوری
کی وجہ سے لوگ اچھے آدمی کو اپنا لیڈر نہیں بناتے۔ کیوں کہ اچھا لیڈر ہمیشہ حقیقت پسندی کی
بات کرتا ہے جس کی اہمیت کو بے شعور عوام سمجھ نہیں پاتے۔ اس کے برعکس برا لیڈر جذباتی
باتیں کرتا ہے جس کو ہر آدمی سمجھ لیتا ہے اور پر جوش طور پر اس کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔
کلکتہ سے مبارک کریم جوہر صاحب بھی اس سمینار میں آئے ہیں۔ ان کی عمر تقریباً پچاس سال ہے۔
اس مدت میں وہ بنگلہ زبان میں پچاس کتابیں لکھ چکے ہیں۔ ان کی کئی کتابیں صوفی ازم پر ہیں۔
میں نے ان سے پوچھا کہ کوئی معرفت کی بات جو آپ نے اپنے مطالعہ میں پائی ہو اس کو بتائیے۔ انھوں
نے حسب ذیل الفاظ اپنے قلم سے لکھے: انسان اپنے کو جاننے سے تمام ادیان کا جاننا
ہو جاتا ہے۔

انھوں نے بتایا کہ کلکتہ کے ہندو پبلشر برابر ان سے اسلامی کتابیں مانگتے رہتے ہیں۔ مگر وہ ان کی فرمائشیں پوری نہیں کر پاتے۔ ان کی کتابیں زیادہ تر ہندو پبلشر نے چھاپی ہیں۔ صحیح بخاری اور اسی طرح کی کئی دوسری کتابوں کا بنگلہ ترجمہ وہ چھپوا چکے ہیں۔ انھوں نے کلکتہ میں انڈین صوفی سماج کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ (Tel. 400475)

ایک مجلس میں ملک کی تقسیم پر بات ہونے لگی۔ ایک صاحب نے کہا کہ مسٹر محمد علی جناح تو ۱۹۳۰ میں لندن چلے گئے تھے اور وہاں پریوی کونسل میں پریکٹس کرنے لگے تھے۔ پانچ سال بعد نواب زادہ لیاقت علی خاں لندن گئے۔ اور ان کو ہندستان واپسی کے لئے آمادہ کیا۔

حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ یہ سب غیر ضروری باتیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم سب کے سب ملک کی تقسیم کے ذمہ دار ہیں۔ اور ہم ہی کو اس کی قیمت ادا کرنا ہے:

We all are responsible for partition and we have to pay the price.

ایک صاحب نے بتایا کہ راج موہن گاندھی نے اپنی انگریزی کتاب (آٹھ زندگیاں) میں لکھا ہے کہ مسٹر محمد علی جناح جب ہندستانی پالٹکس سے الگ ہو کر لندن چلے گئے تو اس کے بعد برٹش سرکار کے کسی ذمہ دار نے بات کرتے ہوئے جواہر لال نہرو سے پوچھا کہ جناح کا معاملہ کیا ہے۔ نہرو نے جواب دیا کہ جناح تو سیاسی اعتبار سے ختم ہو گئے (Jinnah is finished) جناح تک یہ خبر پہنچی تو انھوں نے کہا کہ اچھا، میں ان کو دکھاؤں گا کہ میں کس طرح زندہ ہوں:

Finished, I will show him.

اس کے بعد نواب زادہ لیاقت علی خاں لندن گئے۔ اور مسٹر جناح کو ہندستان واپس آنے کے لئے کہا۔ مسٹر جناح نے کہا کہ آپ ہندستان واپس جائیے اور لوگوں کی رائے معلوم کر کے مجھے بتائیے۔ لیاقت علی خاں واپس آئے۔ اور لوگوں کی رائے معلوم کرنے کے بعد مسٹر جناح کو ایک ٹیلی گرام بھیجا۔ یہ ٹیلی گرام صرف ایک لفظ پر مشتمل تھا —— آجائیے (come) اس طرح مسٹر جناح دوبارہ ہندستانی پالٹکس میں واپس آ گئے۔

انھوں نے بتایا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ ۱۹۳۷ کے الکشن کے بعد جناح کانگرس سے الگ ہو گئے اور ملک کی تقسیم پر پختہ ہو گئے۔ مگر مولانا آزاد کے بیان کے

مطابق، یہ مسئلہ صرف یہ نہیں تھا کہ یوپی کیبنٹ میں کانگرسی مسلمان لئے جائیں یا مسلم لیگی مسلمان۔ اصل یہ ہے کہ مسلم لیگ نے اپنے جن دو آدمیوں کو کیبنٹ میں شامل کرنے کے لئے جو دو نام دئے تھے، وہ لیاقت علی خاں اور عبد الرحمان نشتر تھے۔ دونوں زمیندار طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے جے پرکاش نرائن، رام منوہر لوہیا جو کسان لیڈر تھے، وہ اس کے سخت مخالف ہو گئے۔ یہ لوگ سوشلسٹ ذہن کے تھے اور اس زمانہ میں زمینداری کے خلاف تحریک چلا رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہم زمینداروں کو اپنی کیبنٹ میں لیں تو ہم عوام کو کیا جواب دیں گے۔ یہ وجہ تھی جس کی بنا پر مسلم لیگ کے نامزد افراد کو کیبنٹ میں لینے سے انکار کیا گیا۔

مسٹر بی کے رائے برمن نے اپنے مفصل پیپر میں نارتھ ایسٹ کے قبائل کے لئے حق خود اختیاری (right of self-determination) کی وکالت کی اور اس علاقہ کے مسئلہ کا حل یہ بتایا کہ ان کو اٹانومی دی جائے۔ تاہم انھوں نے کہا کہ حق خود اختیاری سے ان کی مراد حق خود انتظامی (right of self-management) ہے نہ کہ انقطاع (secession)۔ اس سلسلہ میں انھوں نے دستور ہند کے علاوہ اقوام متحدہ کے ڈیکلریشن اور انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز کا حوالہ دیا۔

ایک صاحب نے کہا کہ اصل المیہ یہ ہے کہ ہمارے دستور میں شہریوں کے حقوق کی دفعہ تو موجود ہے۔ مگر اس میں شہریوں کی ذمہ داری کی کوئی دفعہ نہیں۔ چنانچہ اب سارے ملک کا یہ حال ہو رہا ہے کہ لوگ اپنے حقوق کو تو آخری حد تک جانتے ہیں، مگر اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کی انھیں خبر نہیں۔ ہمارا ذہن کچھ اس طرح بن گیا ہے جیسے کہ آزاد ملک کے لوگوں کے صرف حقوق ہوتے ہیں، ان کے کوئی فرائض نہیں ہوتے:

Citizens of a free country have only rights and rights and rights, but no duties.

اس معاملہ میں مسلمانوں کا کوئی استثنا نہیں۔ میں مسلم دانشوروں کی جتنی بھی تحریریں پڑھتا ہوں ہر ایک میں صرف مسلمانوں کے حقوق بتائے جاتے ہیں۔ کوئی بھی نہیں جو مسلمانوں کو بتائے کہ مسلمان جس ملک میں یا جن لوگوں کے درمیان رہتے ہیں ان کے

تئیں ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔

ایک مجلس میں ایک صاحب پرجوش تقریر کر رہے تھے کہ بنگلہ دیش سے مسلمان برابر سرحد پار کر کے ہمارے یہاں آ رہے ہیں، یہ سلسلہ بند ہونا چاہئے۔ دوسرے صاحب نے کہا کہ بنگلہ دیش کو ختم کرنا ہمارے بس میں نہیں ہے، پھر ہم کیا کر سکتے ہیں۔ مسٹر سنجے ہزاریکا نے کہا کہ مائیگریشن موجودہ زمانہ کی ایک عام چیز ہے۔ امریکہ بھی اس کو روک نہیں سکتا، پھر ہم کیسے اس پر روک لگا سکتے ہیں۔

پھر انھوں نے کہا کہ نصف ملین ہندستانی نیپال چلے گئے ہیں۔ وہاں ان کا جانا نیپال کے لئے ایک مسئلہ ہے۔ مگر ہم ایسا نہیں کرتے کہ ان ہندستانیوں کو وہاں سے واپس لانے کی بات کریں۔ پھر بنگلہ دیش والوں پر اتنا شور کیوں۔ ہم ڈبل اسٹینڈرڈ نہیں ہو سکتے۔

ایک صاحب نے کہا کہ اس علاقہ میں علیحدگی پسندی کا رجحان پیدا ہونے کا اصل سبب یہ ہے کہ ترقیات کا فائدہ خواص تک رہ جاتا ہے، وہ عوام تک نہیں پہنچتا:

The fruit of developments do not perculate to the grassroot level.

دوسرے صاحب نے کہا کہ یہی اصل بات نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ پنجاب کو ترقیاتی پروگراموں کا اتنا فائدہ پہنچا کہ وہ ملک کی سب سے زیادہ خوش حال ریاست بن گئی۔ وہاں اس معاملہ میں عوام وخواص میں کوئی تفریق نہیں۔ اس کے باوجود پنجاب میں علیحدگی کی خوں ریز تحریک شروع ہوئی۔

۴ جنوری کی شام کے اجلاس میں مجھے موقع دیا گیا۔ میں دہلی سے ایک انگریزی پیپر تیار کر کے لے گیا تھا جو ملک میں بڑھتی ہوئی علاقائیت پسندی کے خلاف تھا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ علیحدہ خطہ بنانا کسی کے مسائل کا حل نہیں ہے۔ اس معاملہ کو پاکستان اور بنگلہ دیش کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ دونوں ہی مسائل کے حل کے نام پر علیحدہ ملک کے طور پر وجود میں آئے۔ مگر دونوں میں سے کسی جگہ بھی مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ بلکہ مسائل پہلے سے زیادہ بڑھ گئے۔ اس سے ثابت ہوا کہ جغرافی تقسیم یا علیحدگی سے مسائل کے حل کا کوئی تعلق نہیں۔

سیمینار کے ناظم مسٹر نتور ٹھکر نے آخر وقت میں کہا کہ آپ کو ایک اور موضوع پر بھی بولنا ہے۔

وہ مذہبی ہم آہنگی اور کلچرل ٹالرنس کا مسئلہ ہے۔ اس موضوع پر پہلے سے میں نے کچھ تیار نہیں کیا تھا۔ اسی وقت بیٹھ کر انگریزی میں ایک پیپر لکھا اور اس کو وہاں پیش کیا لوگوں نے بہت پسند کیا۔

اس کا خلاصہ یہ تھا کہ مذہبی اختلافات یا کلچرل اختلاف کے مسئلہ کا حل اختلاف کو ختم کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کو ٹالریٹ کرنا ہے۔ اس نقطۂ نظر کی تفصیل کرتے ہوئے آخر میں میں نے کہا کہ اس مسئلہ کا حل سوامی ویویکانند نے ایک جملہ میں اس طرح بتایا ہے—— ایک کی اتباع کرو، اور کسی کے خلاف نفرت نہ کرو:

Follow one, and hate none.

میرا پیپر، دوسرے پیپروں کی طرح، حاضرین کے درمیان تقسیم کیا گیا۔ ہر پیپر کا بیان پہلے سے تیار کی جاتی تھیں اور وہ ہال میں لوگوں میں تقسیم کی جاتی تھیں۔

۴ جنوری کی شام کا اجلاس تاخیر کے ساتھ ساڑھے چھ بجے ختم ہوا۔ ہر آدمی جو اسٹیج پر آتا وہ لمبی تقریر کرنے لگتا۔ جب مقرر مدت سے زیادہ وقت ہو گیا تو صدر اجلاس مسٹر پی ایچ ترویدی (آئی ایس آئی) نے بحث کے خاتمہ کا اعلان کرتے ہوئے مائک اٹھایا تاکہ وہ صدر کی حیثیت سے اپنے آخری کلمات کہہ سکیں۔ عین اس وقت حاضرین میں سے ایک خاتون نے بلند آواز سے کہا "کیا میں ایک منٹ لے سکتی ہوں"۔ صدر نے جواب دیا کہ نہیں، اب وہ ایک منٹ کسی کے لئے باقی نہیں رہا:

We have no that one minute.

یہ سن کر مجھے موت کے لمحہ کا خیال آگیا۔ میں نے سوچا کہ آدمی کی عمر کا آخری وقت جب آئے گا اور موت کا فرشتہ اس کی روح قبض کرنے کے لئے پہنچے گا تو آدمی کہے گا کہ ایک منٹ کی مہلت مجھے اور دے دو۔ فرشتہ جواب دے گا کہ اس ایک منٹ کا وقت گزر چکا۔ اب وہ ایک منٹ کہاں۔

منی پور کے مسٹر نیل کنٹھ شرما نے کہا کہ ہمارے علاقہ کے نوجوان کثرت سے ہتھیار اور ڈرگ کی طرف جا رہے ہیں۔ حتی کہ ڈرگ سے بچانے کے لئے ان کے والدین اپنے بچوں سے کہتے ہیں کہ تم کو شراب پینا ہو تو پی لو، لیکن ڈرگ کے قریب نہ جاؤ۔ یہ سب اس لیے کہ ان

نوجوانوں میں بے روزگاری اور وسائل معاش کی کمی نے سخت فرسٹریشن پیدا کر دیا ہے۔

انفرادی ملاقات میں مسٹر پی ایچ ترویدی نے کہا کہ یہاں جو لوگ اکٹھا ہوئے ہیں، وہ وہ لوگ ہیں جو فساد نہیں کرتے۔ فساد کرنے والے تو دوسرے لوگ ہیں اور ہمارے ان کے درمیان کوئی لنک نہیں۔ میں نے کہا کہ اس کو میں اس طرح کہتا ہوں کہ ہمارے ملک میں ایک پرابلم گروپ ہے اور دوسرا نو پرابلم گروپ۔ چنانچہ میں پچھلے دو سال سے پرابلم گروپ کے لوگوں سے ربط قائم کرکے ان کی سوچ کو بدلنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

انتہا پسند ناگاؤں کے خیالات کتنے سخت ہیں، اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہاں ہم ایک اقتباس نقل کرتے ہیں۔ ۶۲ سالہ مسٹر مویئوا (Thuingaleng Muivah) مشہور ناگا لیڈر ہیں۔ وہ نیشنل سوشلسٹ کونسل آف ناگالینڈ کے فاؤنڈر ہیں۔ ان کے اوپر کئی قاتلانہ حملے ہو چکے ہیں۔

سنڈے کے نمائندہ مسٹر سوبیر بھومک (Subir Bhaumik) اور ان کے ساتھی تھائی لینڈ اور برما کی سرحد پر ایک خفیہ مرکز میں ان سے ملے۔ وہ لوگ ۸ گھنٹہ تک جنگلوں میں سفر کرکے مسٹر مویئوا کے یہاں پہنچے تھے۔ انھوں نے ناگالیڈر کا انٹرویو لیا جس کو خود ناگا لیڈر انٹرویو کے بجائے انٹرایکشن کہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ سنڈے کے شمارہ ۱۶ جون ۱۹۹۶ میں یہ انٹرویو پانچ صفحات پر چھپا ہے جس کے ساتھ کئی تصویریں بھی شامل ہیں۔ اس انٹرویو کا ایک سوال وجواب یہاں نقل کیا جاتا ہے:

Q. But unless you start talking, how do you know how sincere India is about a settlement?

A. Mr. Bhaumik, it may hurt your feelings as an Indian if we tell you how bad our experience has been in this regard. India's government, her bureaucrats are masters of double-talk, your society has so much double standard. I have read your epics and even your heroes like Rama and Krishna have made and broken rules at their convenience. Rama used dissension to subjugate Bali's kingdom, a kingdom of tribals. His brother Sugriv was used. Krishna signalled to Bhim to hit Duryodhana below his waist when Bhim was all at sea. Whenever rules have proved to be problem, your society and its leaders have flouted it, expecting everyone else to observe them.

Sunday weekly, Calcutta, 16-22 June 1996, p. 50

اشانی کے شمارہ اپریل ۱۹۹۶ میں منی پور کے شہری رتن تھیم (Ratan Thiyyam) کا انٹرویو چھپا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج کی دنیا میں مجھ سے زیادہ غم گین شاید اور کوئی نہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آج میرے وطن منی پور کی کوئی بھی چیز اپنی جگہ پر باقی نہیں رہی :

Nothing seems to be in place in Manipur today.

انھوں نے کہا کہ پہلے ہم منی پور کے لوگ بہت آسودہ زندگی گزارتے تھے۔ ہمارا ہر معاملہ درست تھا۔ کھانا پینا، ہر چیز فراغت کے ساتھ ملی ہوئی تھی۔ آج سب کچھ تباہ ہو چکا ہے۔ قدیم روایتیں ختم ہو گئیں۔ ہمارا اعتماد جاتا رہا۔ ۳۰ سال کی مدت میں پوری زندگی کچھ سے کچھ ہو گئی۔

یہ سب نتیجہ ہے علیحدگی پسندی کی انتہا پسندانہ اور متشددانہ تحریک کا۔ میں نے اس کو پڑھا تو میں نے سوچا کہ آج ٹھیک یہی حال ان تمام مسلم علاقوں کا بھی ہے جہاں آزادی کے نام پر اسی قسم کی تحریکیں چلائی گئیں۔ مثلاً بوسنیا، چیچنیا، برما، فلپائن، فلسطین، وغیرہ۔ ہر جگہ آج سے "۳۰ سال" پہلے مسلمان نہایت عمدہ حالت میں تھے۔ ہر قسم کی ترقی کے مواقع انھیں حاصل تھے۔ مگر انھوں نے متشددانہ قسم کی سیاسی تحریکیں چلا دیں۔ اس کے نتیجہ میں ملا ہوا بھی تباہ ہو گیا۔ اور مزید کچھ تو ملنے والا ہی نہ تھا۔

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ لوگوں کو اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ وائلنٹ ایکٹوزم کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اب صرف نان وائلنٹ ایکٹوزم یا پیس فل ایکٹوزم ہی ممکن ہے۔ اور وہ بھی اس وقت جب کہ فی الواقع اس کی ضرورت پیش آ گئی ہو۔

نارتھ ایسٹرن انڈیا میں علیحدگی پسندی کے رجحان کو ختم کرنے اور اس کو ملک کی مین اسٹریم میں لانے کے لئے بار بار نئی دہلی اور مقامی لیڈروں کے درمیان میٹنگیں ہوئیں اور اکارڈ طے پائے۔ مگر نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ مثلاً :

Shillong Accord 1975, Assam Accord 1985, Mizoram Accord 1986, Tripura Accord 1988, Bodo Accord 1994

اس کے باوجود اس علاقہ کی بےچینی ختم نہیں ہوئی۔ درجنوں عسکری تنظیمیں بدستور پورے علاقہ میں سرگرم ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس علاقہ کی معاشی اور تمدنی پسماندگی بدستور باقی ہے۔

ہندستان ٹائمس کے اسسٹنٹ اڈیٹر مسٹر آش نرائن رائے کا ایک مقالہ جنرل آف پیس اسٹڈیز (نئی دہلی) کے شمارہ جولائی۔ اگست ۱۹۹۵ میں چھپا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ اس علاقہ میں امن اور ہم آہنگی کی کنجی محض اکارڈوں پر دستخط کرنا نہیں ہے بلکہ ضرورت یہ ہے کہ یہاں اقتصادی ترقی لائی جائے اور لوگوں کو زیادہ سے زیادہ معاشی وسائل فراہم کئے جائیں:

> The key to peace and harmony in the region lies not in merely signing accords but in the rapid economic development and the widening of economic opportunities. (Ash Narain Roy)

جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے، خرابی کی اصل جڑ کرپشن ہے، مرکزی حکومت کی طرف سے اس علاقہ کی ترقی کے لئے بہت بڑی رقمیں منظور کی گئیں مگر وہ زیادہ تر لوگوں کی جیبوں میں چلی گئیں۔ اس علاقہ کے ترقیاتی کاموں میں وہ بہت کم استعمال ہو سکیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ یہ درست ہے کہ نارتھ ایسٹ ایریا ایک پرابلم ایریا بن گیا ہے۔ لیکن ہر مسئلہ کا الزام حکومت کو دینا صحیح نہیں۔ میں نے کہا کہ یہ تو ہم اپنے عمل کی قیمت بھگت رہے ہیں۔ ۱۹۴۷ سے پہلے جب ہندستان میں آزادی کی تحریک چل رہی تھی تو ہمارے سیاسی لیڈر ہر مسئلہ کا الزام برٹش گورنمنٹ کو دیدیتے تھے، خواہ وہ کوئی بھی مسئلہ ہو۔ اس وقت یہ بات بہت اچھی لگتی تھی۔ کیوں کہ اس طرح عوام انگریزوں کے خلاف اٹھ رہے تھے اور وہ عوامی طاقت ظہور میں آرہی تھی جو ہماری بے تشدد تحریک آزادی کو طاقت ور بنانے کے لئے ضروری تھی۔

اس طرح عوام کی نفسیات یہ بن گئی کہ تمام مسائل کی ذمہ دار حکومت ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ اپنے اس مزاج کی بنا پر اب وہ اسی طرح ہر خرابی کا الزام قومی حکومت کو دے رہے ہیں۔ یہ قیمت ہمیں اس وقت تک بھگتنا ہوگا جب تک عوام میں نیا شعور پیدا نہ کر دیا جائے۔

ایک پرانے گاندھی وادی نے بتایا کہ جب وہ نوجوان تھے، وہ کھادی کی ایک کانگرسی دکان پر کپڑا خریدنے گئے۔ دکان والے نے پوچھا: ہاتھ کھادی یا مل کھادی۔ یعنی ہاتھ سے بنے ہوئے سوت کی کھادی یا مل میں تیار کئے ہوئے سوت کی کھادی۔ مذکورہ نوجوان کو اس سے بہت دھکا لگا۔ انھوں نے مہاتما گاندھی کو خط لکھا کہ میرے ساتھ ایسا ایسا واقعہ گزرا۔ کیا کھادی بھی دو کھادی ہوتی

ہے۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔

گاندھی جی نے اس خط کا جواب اپنے پرچہ ینگ انڈیا میں دیا۔ انھوں نے لکھا کہ نوجوان کو اس طرح کے معاملات میں زیادہ حساس (oversensitive) نہیں ہونا چاہئے۔ میں نے کہا یہ نہایت صحیح جواب تھا۔ اگر معاملہ حق اور ناحق کا ہو تو آدمی کو ضرور بہت زیادہ حساس ہونا چاہئے۔ مگر جو معاملہ حق اور ناحق سے تعلق نہ رکھتا ہو تو اس میں نظر انداز کرنے کی پالیسی اختیار کرنا ضروری ہے۔ اس فرق کے بغیر زندگی کا نظام نہیں چلایا جا سکتا۔

ایک صاحب نے کہا کہ گاندھی جی جب ساؤتھ افریقہ سے آئے تو وہ کوٹ پتلون پہنتے تھے۔ پھر گاندھی جی نے کہا کہ آزادی کی تحریک میں شریک ہونے سے پہلے میں سارے دیش میں گھوم کر لوگوں سے ملوں گا۔ چنانچہ انھوں نے پورے ملک کا دورہ کیا۔ انھوں نے دیکھا کہ ملک میں بے شمار لوگ ابھی تک غربت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کے جسم پر پورا کپڑا بھی نہیں ہے۔ اس کے بعد گاندھی جی نے کہا کہ جس دیش میں غریبوں کی اکثریت ہو وہاں آزادی کی تحریک چلانے کے لئے مجھے خود بھی غریب ہندستانی کی طرح رہنا ہوگا۔ یہ کہہ کر انھوں نے کوٹ پتلون اتار دیا اور وہ کپڑا پہن لیا جس کو دیکھ کر برطانیہ کے سرونسٹن چرچل نے ان کو ننگا فقیر (naked fakir) کہا تھا۔

کوہیما سے ایک انگریزی اخبار نکلتا ہے۔ اس کا نام جرنل (The Journal) ہے۔ اس کے شمارہ ۱۷ نومبر ۱۹۹۴ میں ایک جائزہ چھپا تھا۔ اس کا عنوان تھا ــــ جبری استحصال کی زمین (A Land of Extortion) اس میں بتایا گیا تھا کہ اس علاقہ کے بیرونی آئی اے ایس افسران بہت غیر مطمئن حالت میں ہیں۔ وہ جلد سے جلد یہاں سے چلے جانا چاہتے ہیں:

> Non-local IAS officers want to be transferred out of Nagaland as quickly as possible.

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ہر وقت ان کو اپنی جان کا خطرہ رہتا ہے۔ غیر مقامی افسروں کو یہاں کے لوگ اسی نظر سے دیکھتے ہیں جس طرح ۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان میں انگریز افسران کو دیکھا جاتا تھا۔ مقامی لیڈروں کی تقریروں نے اس معاملہ میں لوگوں کو اتنا جذباتی بنا دیا ہے کہ غیر مقامی افسروں کو دیکھ کر وہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ ہم کو غلام بنانے کے لئے یہاں آئے ہیں۔

اگرتلہ (تری پورہ) کی شری متی کرا بی دیو برمن نے اپنے پیپر میں نارتھ ایسٹ انڈیا کے بارہ پرابلم گنائے۔ ان میں سے بارھواں یہ تھا —— سب سے زیادہ اہم یہ کہ اس علاقہ کے لوگوں میں ایسے مشترک رشتہ کی غیر موجودگی کہ وہ اپنے آپ کو انڈین محسوس کریں:

Above all absence of a common chord or a binding force to feel 'Indian'.

یہ بلاشبہ سب سے زیادہ اہم بات ہے۔ اگر انڈین ہونے کا مشترک احساس موجود ہو تو بقیہ مسائل اپنے آپ غیر اہم بن جاتے ہیں۔ اور اگر یہ مشترک احساس باقی نہ رہے تو اس کے بعد غیر اہم چیز بھی اہم بن جائے گی۔

مقامی انگریزی اخبار ناگالینڈ ٹائمس (۲۳ نومبر ۱۹۹۴) میں اس علاقہ کی سات ریاستوں کے بارہ میں ایک رپورٹ چھپی تھی جس کا عنوان تھا:

Symphony of the Seven Sisters.

اس میں بتایا گیا تھا کہ نارتھ ایسٹ کی سات ریاستوں (آسام، ناگالینڈ، منی پور، میگھالیہ، میزورم، ارونا چل پردیش، تری پورہ) میں ہر ایک کا مخصوص کلچر ہے۔ ہر ایک کا مذہب اور زبان الگ الگ ہے۔ ان پر پڑوسی ممالک برما، چین، تبت کلچر کے اثرات ہیں۔ چنانچہ اس علاقہ کی کوئی مشترک زبان نہیں۔ اس کی وجہ سے "سات بہنوں" کا باہمی اتحاد بے حد مشکل ہو گیا ہے۔

ناگالینڈ ٹائمس کی اس رپورٹ میں مزید بتایا گیا تھا کہ درحقیقت انڈیا کا ہندو کلچر ان قبائل کے لئے اجنبی ہے جو کہ بنیادی طور پر گوشت خور ہیں:

Hindu culture is much alien to the psyche of the tribals who are basically non-vegetarians and liberated in their way of life.

اس میں بتایا گیا تھا کہ نارتھ ایسٹ کا یہ علاقہ ۱۸۲۶ میں امریکن اور یوروپین مشنری کے زیر اثر آیا۔ اور اس پہاڑی علاقہ میں مسیحیت نے اپنی جڑیں قائم کر لیں۔ یہ ان مسیحی مبلغین کے ذریعہ ہوا جنھوں نے ان پہاڑیوں میں انتھک محنتیں کیں۔ مثال کے طور پر میگھالیہ کے قبائل کی بولی کو لکھنے پڑھنے کی زبان بنانے کا کارنامہ ٹامس جونز (Rev. Thomas Jones) وغیرہ نے کیا۔ ان لوگوں نے میگھالیہ کے قبائل کو ان کی پہلی مطبوعہ کتاب دی۔ انھوں نے یہاں اسکول اور اسپتال

قائم کئے۔ انھوں نے اس علاقہ کے لوگوں کو پہلی بار علم سے آشنا کیا۔ تاہم ان مسیحی مبلغوں کے اثرات سے منی پور اور ارونا چل بچا رہا۔

۴ جنوری کی شام کو کھانے کی میز پر کچھ اعلیٰ تعلیم یافتہ صاحبان تھے۔ وہ گاندھی واد میں یقین رکھتے تھے۔ ڈاکٹر جینت پاٹل (ممبر پلاننگ کمیشن) نے کہا کہ ساری سمسیاؤں کا حل گاندھی واد میں ہے۔ گاندھی کے وچاروں کو دیش میں لانا ہوگا، تبھی دیش کا بھلا ہو سکتا ہے۔

میں نے کہا کہ ۱۹۴۷ کے بعد مہاتما گاندھی کے اپنے بنائے ہوئے ساتھی ان سے پھر گئے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے جو گاندھی ہیرو بنا ہوا تھا، وہ ۱۹۴۷ کے بعد خود اپنے ملک میں زیرو ہو گیا۔ چنانچہ اس وقت مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ "اب میری کون سنے گا"۔ ان کے اسی جملہ کو پیارے لال نے اپنی کتاب کا ٹائٹل بنایا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد انڈیا میں خود گاندھی جی اپنے وچاروں کو عمل کی صورت نہ دے سکے۔ پھر اب کون ہوگا جو ان کو عملاً قائم کرے۔ کیا آپ کہیں سے ایک سپر گاندھی لا سکتے ہیں۔ بمبئی کے پروفیسر رو ندر کیلیکر بھی اس گفتگو میں شریک تھے۔

پھر میں نے کہا کہ وہ مقام جہاں گاندھی واد فیل ہوا ہے وہ لارڈ ایکٹن کے الفاظ میں انسان کی یہ کمزوری ہے کہ طاقت اور اقتدار آدمی کو بگاڑ دیتا ہے:

Power currupts and absolute power corrupts absolutely.

کانگرس کے لیڈروں کے بگڑنے کا اصل سبب یہی تھا۔ اب ہمیں اس انسانی کمزوری کا حل تلاش کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر ہمارے خوابوں کا نیا ہندستان بننے والا نہیں۔

ایک مجلس میں یہ بحث تھی کہ سیاسی استحکام کیسے حاصل کریں۔ (how to attain political stability) مختلف لوگوں نے مختلف باتیں کہیں۔ میں نے کہا کہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد کوئی بھی پارٹی اپنے حق میں نئی سیاسی روایات قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ کانگرس بعد از آزادی کارکردگی پر زندہ نہیں تھی بلکہ قبل از آزادی روایات کے سہارے زندہ تھی۔ کانگرس کا سارا سرمایہ جدوجہد آزادی کے دور کی روایات تھیں۔ یہ سرمایہ اب اپنی آخری حد پر پہنچ کر ختم ہو گیا۔

بھاجپا کے پاس کوئی مثبت پیغام نہ تھا۔ اس نے دو بڑے فرقوں کے درمیان چھپی ہوئی

تاریخی نفرت کو استعمال کیا، مگر اس کی بھی ایک حد تھی - ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو خود اسی کے ہاتھوں اس کی آخری حد آگئی - اب ملک میں ایک قسم کا سیاسی خلا ہے، اور ملک کسی ایسے نئے گروہ کا منتظر ہے جو ظاہر ہو اور دوبارہ ملک کو سیاسی استحکام دے سکے -

نارتھ ایسٹ انڈیا سات مختلف ریاستوں پر مشتمل ہے. اس لئے ان کو سات بہنیں کہا جاتا ہے۔ دھنک میں چوں کہ سات الگ الگ رنگ ہوتے ہیں، اس لئے ان ریاستوں کے مجموعہ کو زمینی دھنک کا نام بھی دیا گیا ہے :

a rainbow on the ground.

ان سات ریاستوں میں آپ گھومیں پھریں تو آپ کو ہر طرف وہاں مسائل ہی مسائل دکھائی دیں گے۔ مگر الفاظ کی دنیا میں اس کی تصویر اس بالکل برعکس دکھائی دیتی ہیں۔ جو لوگ صرف الفاظ کو دیکھ کر حقیقت کے بارہ میں رائے قائم کریں وہ ہمیشہ اصل حقیقت کے ادراک سے محروم رہیں گے۔

۵ جنوری کو صبح ۳ بجے نیند کھلی۔ مجھے ٹی وی کا کوئی شوق نہیں ۔مگر میں نے سوچا کہ دیکھیں کیا رات کو بھی ٹی وی کے پروگرام آتے ہیں۔ میں نے یہ جاننے کے لئے ٹی وی سیٹ کھولا تو اس وقت کئی پروگرام آرہے تھے ۔ایک چینل سے کھیل کا پروگرام آرہا تھا۔ دوسرے چینل پر غالباً کوئی انگریزی فلم دکھائی جا رہی تھی۔ اس کا جو منظر میرے سامنے آیا اس میں ایک مرد اور ایک عورت کھڑے ہوئے تھے۔ عورت اپنے اتارے ہوئے کپڑے کو پہن رہی تھی۔ اس نے اپنے کھلے جسم پر مختصر لباس پہنا اور مرد کی ناک پر پستول رکھ کر اسے گولی مار دی۔

ہندستان میں کچھ لوگ یہ لکھنے اور بولنے میں مشغول ہیں کہ ہندو ایک منظم سازش کے تحت ہمارے ملی تشخص کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ یہ بے حد سادہ لوحی کی بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں ہندو اور مسلمان دونوں کے روایتی تشخص کو مٹانے کا کام سٹلائٹ ٹی وی کر رہا ہے جس کی زد سے اپنے آپ کو بچانا دونوں میں سے کسی کے لئے بھی ممکن نہیں۔ یہ ٹی وی رات دن کھیل کود، مار دھاڑ اور سیکس کے مناظر دکھاتا رہتا ہے۔ اس کی ہمہ گیری کا یہ حال ہے کہ

زمین پر اگر آپ اس کو روکیں تو وہ آسمان سے آپ کے گھروں میں داخل ہو جائے گا۔ یہ طوفانی سیلاب نہ صرف ہندستان کو بلکہ تمام عرب دنیا اور مسلم دنیا کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے۔ میری طرح کے کچھ لوگ جو اپنے ذوق کے تحت محفوظ نہ ہو سکتے ہوں وہی اس سے بچے ہوئے ہیں۔ ورنہ نام نہاد دیندار گھرانے تک اس فتنہ سے محفوظ نہیں۔

۵ جنوری ۱۹۹۵ کی صبح کو ناشتہ کی میز پر مسٹر نرویدی (آئی اے ایس) سے گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ انڈیا کے جھگڑوں کو ختم کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ مذہب کے بارہ میں گاندھی جی کے نظریہ کو پھیلایا جائے۔ یعنی یہ کہ تمام مذاہب ایک ہیں۔

میں نے کہا کہ اس معاملہ میں دو نقطۂ نظر ہیں۔ ایک یہ کہ تمام مذاہب ایک ہیں۔ یہ نظریہ بظاہر خوبصورت معلوم ہوتا ہے مگر وہ یقینی طور پر قابل عمل نہیں۔ شہنشاہ اکبر سے لے کر ڈاکٹر بھگوان داس (اسینشل یونیٹی آف آل ریلیجنز) اور مہاتما گاندھی تک غیر معمولی کوشش کے باوجود یہ نظریہ سراسر ناکام رہا ہے:

حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ کا حل باہمی اعتراف (mutual recognition) میں نہیں ہے بلکہ باہمی احترام (mutual respect) میں ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ ناگالینڈ اور منی پور کی حیثیت ٹائم بامب کی ہو چکی ہے۔ دوسرے صاحب نے کہا کہ یہ صرف دو ریاستوں کی بات نہیں۔ بلکہ نارتھ ایسٹ کا پورا علاقہ آج اسی حالت کو پہنچ چکا ہے۔ اس طرح کی اور بہت سی باتیں لوگ کر رہے تھے، اور میں سوچ رہا تھا کہ اردو اخباروں میں ہمارے لکھنے والے جو کچھ لکھتے ہیں، اس کے مطابق، اردو خواں مسلمانوں کو صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ اس علاقہ میں مسلمانوں کے خلاف شدید تعصب ہے اور بنگلہ دیشی کے نام پر مسلمانوں کو یہاں سے نکالا جا رہا ہے۔ حالانکہ "بنگلہ دیشی مسئلہ" اس علاقہ میں پیدا شدہ مسائل کا صرف ایک فیصد ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ مذہب اور کلچر کے اختلافات میں یہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنے مذہب کی پیروی کرتے ہوئے دوسروں کے مذہب کا احترام کریں:

We have to respect other religions while following our own.

میں نے کہا کہ اس معاملہ میں یہی صحیح ترین بات ہے اور یہی واحد قابل عمل صورت ہے۔ اس معاملہ میں ہمیں پریکٹیکل بننا چاہئے نہ کہ آئیڈیلسٹ۔ عجیب بات ہے کہ ذاتی انٹرسٹ کا معاملہ ہو تو ہر آدمی پریکٹیکل بن جاتا ہے۔ مگر جب ملک اور سماج کے بارہ میں گفتگو ہو تو ہر آدمی آئیڈیلزم کی بات کرنے لگتا ہے۔ اسی دوطرفہ معیار نے سارے مسائل پیدا کئے ہیں۔

سیمنار کا مقصد ان لفظوں میں بتایا گیا تھا کہ —— نارتھ ایسٹ اور ملک کے بقیہ حصوں کے دانشوروں کو باہمی تبادلہ خیال کا موقع دینا:

to facilitate interaction between the intellectuals of the North-East and the rest of the country.

مگر میرا تجربہ ہے کہ برصغیر ہند کے دانشوروں کا تبادلۂ خیال ہمیشہ بے فائدہ ثابت ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں سننے اور ماننے کا مزاج نہیں۔ ہر ایک میں صرف سنانے اور منوانے کا مزاج ہے۔ یہاں کا ہر آدمی اعجاب کل ذی رأی برایہ کا مصداق ہے۔ ایسے لوگوں کے درمیان تبادلۂ خیال کبھی کسی مثبت نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔

گوہاٹی کا یہ انٹرنیشنل سیمنار بڑی امیدوں کے ساتھ کیا گیا تھا۔ اس کا اہتمام ناگالینڈ گاندھی آشرم کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ مختلف اداروں نے اس کے ساتھ تعاون کیا۔ خاص طور پر حسب ذیل ادارہ نے:

North-East Institute of Bank Management (NEIBM)

اس کا بنیادی موضوع تھا: نارتھ ایسٹ انڈیا اور اکیسویں صدی۔ اس کے چھ ذیلی موضوعات مقرر کئے گئے تھے۔ ان میں سے ایک موضوع یہ تھا:

North-East, a rainbow on the ground
Religious and ethnic pluralism—amity through diversity
—a future perspective.

آخری اجلاس میں منتظمین کی طرف سے ایک رزولیوشن کا ڈرافٹ پیش کیا گیا۔ اس پر بحث ہوئی۔ یہاں تک کہ اس کو رد کر دیا گیا۔ پھر یہ طے ہوا کہ ایک اسٹیٹمنٹ جاری کیا جائے۔

اس کا ڈرافٹ بھی رد ہوگیا۔ آخر میں طے ہوا کہ اجلاس کے دوران جو مختلف رائیں سامنے آئی ہیں، ان کا خلاصہ تیار کیا جائے اور اس کو اشاعت کے لئے دے دیا جائے۔ دو آدمیوں نے اس کا ڈرافٹ تیار کیا۔ مگر وہ بھی منظور نہ ہوسکا۔ آخر کار یہ سیمینار اس طرح ختم ہوا کہ اس کی طرف سے کوئی متفقہ چیز پریس میں اشاعت کے لئے نہ دی جاسکی۔

میں بے حد غم زدہ حالت میں یہ تمام بحثیں سن رہا تھا۔ آخر میں میں نے کہا کہ کیسی عجیب بات ہے کہ ایک سنگین قومی مسئلہ پر پورے ملک کے دماغ اکٹھا ہوئے۔ تین دن کے بحث و مباحثہ کے بعد اب وہ یہاں سے واپس جارہے ہیں۔ اور حالت یہ ہے کہ ہم اتنا بھی نہیں کرسکے کہ ایک متفقہ بیان تیار کرکے کل کے اخبار میں دے دیتے تاکہ لوگ کم سے کم یہ جان لیں کہ ہم نے انھیں کیا پیغام دیا ہے۔

۶ جنوری کی شام کو واپسی تھی۔ ہوٹل سے ایرپورٹ تک کے سفر میں دو صاحبان کا ساتھ تھا۔ پرتاپ سنگھ اور عبدل بھائی۔ ایرپورٹ پر دیر تک ان لوگوں سے گفتگو ہوئی۔ پرتاپ سنگھ ایک سیاسی آدمی ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ تمام لیڈر کرپٹ ہیں، خواہ ایک پارٹی کے ہوں یا دوسری پارٹی کے۔ میں نے کہا کہ پالی ٹکس میں ہمیشہ کرپشن رہتا ہے۔ البتہ اس کو ایک حد کے اندر رہنا چاہئے۔ ہندستان کی مصیبت یہ ہے کہ یہاں کا کرپشن حد سے باہر چلا گیا ہے۔

عبدل بھائی مسلمانوں میں نکاح و طلاق کے مسائل سے بہت پریشان تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس سلسلہ میں کچھ اصلاحی قانون بننا چاہئے۔ میں نے کہا کہ اس معاملہ میں اصل مسئلہ قانون کا نہیں ہے، بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم بہت کم ہے۔ تعلیم یافتہ آدمی ہی جانتا ہے کہ کیسے جینا چاہئے۔ اس لئے اگر آپ اصلاح چاہتے ہیں تو قوم کو تعلیم یافتہ بنائیے، اس کے بعد تمام مسائل اپنے آپ حل ہو جائیں گے۔

۶ جنوری ۱۹۹۵ کو گوہاٹی سے دہلی کے لئے واپسی ہوئی۔ یہ سفر انڈین ایرلائنز کی فلائٹ نمبر ۸۹۰ کے ذریعہ طے ہوا۔ گوہاٹی سے واپسی میں جہاز کے نیچے بادلوں کی گہری چادر نہیں تھی۔ ہمارا جہاز بنگلہ دیش کے اوپر سے اڑتے ہوئے ہندستانی علاقہ میں

داخل ہوا۔ میں نے جہاز کے نیچے دیکھا تو درختوں سے ڈھکا ہوا بنگلہ دیش ایک جنگل کی تصویر پیش کر رہا تھا۔

مجھے یاد آیا کہ ایک ہندستانی جرنلسٹ مسٹر چنچل سرکار نے حال میں بنگلہ دیش کا سفر کیا تھا۔ اس کے بعد ان کا ایک تبصرہ دہلی کے انگریزی اخبار پانیر میں چھپا تھا۔ مسٹر سرکار نے بنگلہ دیش میں مختلف قسم کے لیڈروں سے ملاقات کی۔ کوئی اسلامی سیاست کی بات کرتا تھا اور کوئی سیکولر سیاست کی۔ مگر ہر ایک کا اسلام بھی الگ تھا اور ہر ایک کا سیکولرزم بھی الگ۔ چنانچہ انھوں نے بنگلہ دیش کو ایک سیاسی جنگل (political jungle) سے تعبیر کیا تھا۔

یہ صرف بنگلہ دیش کی بات نہیں۔ اختلافات کی کثرت نے آج پوری مسلم دنیا کو اسی طرح کی صورت حال میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اتحاد کے لئے یہی کافی نہیں ہے کہ قوم کے پاس ایک کتاب اور ایک قرآن ہو۔ اگر لوگوں کا مزاج بگڑا ہوا ہو تو وہ ایک کتاب کی سیکڑوں تعبیر کرکے دوبارہ قوم کو افکار کے ایک جنگل میں بھٹکا دیں گے۔

اس قسم کی صورت حال ہمیشہ نااہل لوگوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ بولنے کے قابل لوگوں کے لئے جتنا بولنا ضروری ہے اتنا ہی ضروری یہ ہے کہ وہ لوگ جو بولنے کے قابل نہیں ہیں وہ نہ بولیں۔ ۹۹ آدمی چپ رہیں اسی وقت ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی بولے اور اس کا بولنا لوگوں کے لئے مفید ثابت ہو۔

گوہاٹی سے دہلی تک ڈھائی گھنٹہ کا سفر تھا۔ درمیان میں کچھ اخبارات پڑھے۔ آسام ٹریبیون (گوہاٹی) کے شمارہ ٦ جنوری ۱۹۹۵ کے صفحہ اول پر ریاستی حکومت کے حوالے سے یہ خبر تھی کہ تری پورہ میں قبائلی جنگجوؤں (tribal militants) کے پاس جدید ہتھیاروں (sophisticated arms) کی بھاری مقدار پہنچ گئی ہے۔ وہ انسانوں کے اوپر ان ہتھیاروں کا تجربہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ اخبار کی اسی اشاعت میں کئی خبریں تھیں کہ اچانک موٹر سائیکل پر کچھ لوگ آئے اور بے قصور لوگوں پر فائر کرکے بھاگ گئے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو علاقہ کی آزادی کے نام پر اپنی متشددانہ تحریک چلا رہے ہیں۔ اس

کے بجائے اگر وہ یہ کہیں کہ ہم نراج اور بدامنی لانے کے لئے تحریک چلارہے ہیں تو یہ زیادہ صحیح بات ہوگی۔

بد قسمتی سے ٹھیک یہی حال مسلم دنیا کا ہے۔ جگہ جگہ مسلم نوجوانوں نے اسلام کے نام پر ہتھیار اٹھا رکھا ہے۔ حالاں کہ ان کی اس تشدد دانہ تحریک سے آج بھی صرف قتل وخون برآمد ہورہا ہے اور آئندہ بھی اس سے قتل وخون ہی کا تحفہ لوگوں کو ملنے والا ہے۔ اس کی ایک واضح مثال افغانستان ہے۔

ہوائی جہاز کے نیچے جو پہیہ ہوتا ہے وہ ایئر پورٹ پر جہاز چلانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جب جہاز اوپر اٹھ کر اڑنے لگتا ہے تو پہیہ اندر کی طرف اٹھا لیا جاتا ہے۔ میں نے پائلٹ سے پوچھا کہ لینڈنگ کے وقت اگر آپ پہیہ کو نیچے گرانا بھول جائیں تو کیا ہوائی جہاز حادثہ کا شکار ہو جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ معمولی نقصان تو ہوگا، لیکن اس سے کوئی بڑا حادثہ پیش نہیں آئے گا۔ انھوں نے بتایا کہ لینڈنگ کے وقت پہیہ نیچے گرانے کے لئے یاددہانی کے مختلف انتظامات کئے گئے ہیں۔ نئے ہوائی جہازوں میں کمپیوٹرائزڈ ریکارڈنگ ہوتی ہے جو لینڈنگ کے وقت پائلٹ کو ان الفاظ میں مسلسل وارننگ دیتی ہے:

Check your landing gear, check your landing gear.

میں نے پوچھا کہ جہاز کا پہیہ (لینڈنگ گیر) اوپر کیوں اٹھا لیا جاتا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ شاید اونچی بلڈنگ یا پہاڑ وغیرہ کی ٹکر سے بچانے کے لئے ایسا کیا جاتا ہوگا۔ انھوں نے بتایا کہ نہیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ پہیہ دس فٹ یا اس سے بھی زیادہ لمبا ہوتا ہے۔ اگر پہیہ نیچے لٹکا رہے تو اس کی وجہ سے ہوائی رکاوٹ پیدا ہو جائے گی:

Drag is created if the landing gear is down.

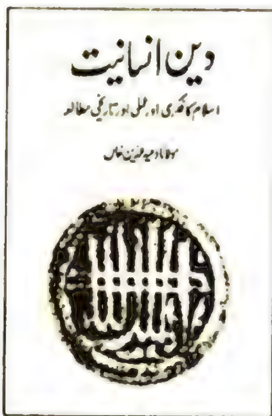
جہاز تقریباً دو گھنٹہ لیٹ ہو کر ساڑھے پانچ بجے شام کو دہلی پہنچا۔ جہاز کے اندر اعلان میں مسافروں سے کہا گیا کہ اس دیری کے کارن آپ کو جو اسوبیدھا ہوئی اس کے لئے ہم چھما چاہتے ہیں۔ تاہم انڈین ایئر لائنز کے لئے یہ ایک معمول کی بات ہو چکی ہے۔ اور اس کے نتیجے میں لوگوں کو طرح طرح کی زحمتیں پیش آتی ہیں۔

آج کے اخبار میں ایک خبر یہ تھی کہ حکومت ہند کے ایک ذمہ دار نے کہا کہ ترقی کا فائدہ ہمیں ہندستان کے عام شہریوں تک پہنچانا ہے۔ میں نے سوچا کہ ہوائی جہاز میں جو لوگ سفر کرتے ہیں وہ تو خواص کے طبقہ سے تعلق رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ پھر پچاس سال کی قومی حکومت کے باوجود جب ترقی کا فائدہ ملک کے خواص تک بھی پوری طرح نہیں پہنچا تو ملک کے عوام تک ترقی کا فائدہ پہنچانے کے لئے آخر کتنا زیادہ وقت درکار ہوگا۔

۶ جنوری ۱۹۹۵ کی شام کو میں دہلی واپس پہنچا۔

خصوصی اعلان

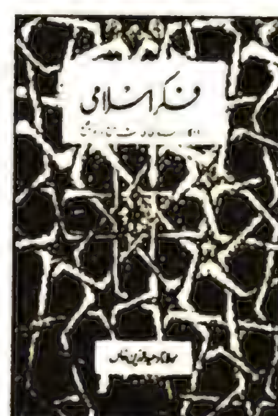
دفتر میں ماہنامہ الرسالہ کے پرانے متفرق شمارے (اردو اور انگلش دونوں زبانوں میں) بڑی تعداد میں جمع ہو گئے ہیں، جس کو افادۂ عام کی غرض سے نہایت ارزاں قیمت پر فراہم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ایک شمارہ کی قیمت ۲ روپے ہوگی۔ جبکہ ۱۰۰ یا اس سے زائد شمارے منگوانے کی صورت میں مزید ایک روپے کی تخفیف کر دی جائے گی۔ یعنی ۱۰۰ روپے میں ۱۰۰ شمارے۔ نیز ڈاک خرچ بھی مکتبہ کے ذمہ ہوگا۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ بطور خود اور مقامی اصحاب خیر کو ترغیب دے کر اس پروگرام میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں۔ تاکہ الرسالہ کے دعوتی اور تعمیری مشن سے وہ لوگ بھی آشنا ہو جائیں جو اب تک کسی وجہ سے آشنا نہ ہو سکے۔ (مینجر ماہنامہ الرسالہ)



Size 22×14.5cm,
320 pages; Rs. 60



Size 22×14.5cm,
192 pages; Rs. 40



Size 22×14.5cm,
240 pages; Rs. 50

خبر نامہ اسلامی مرکز

۱ تمل ناڈ مسلم ویلفیئر ایسوسی ایشن کی طرف سے نئی دہلی میں ایک آل انڈیا کانفرنس ۴-۵ جنوری ۱۹۹۷ کو ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور وہاں کے جلسۂ عام میں ایک تقریر کی۔ اس تقریر کا موضوع تھا: دی کانسپٹ آف پیس ان اسلام۔

۲ نومبر ۱۹۹۶ کے آخری ہفتہ میں پونا میں فلاسفیکل کانگرس کی طرف سے ایک انٹرنیشنل میٹنگ ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور امن اور اسلام کے موضوع پر وہاں تقریر کی۔ اس کے علاوہ پونا میں کچھ اور پروگرام ہوئے۔ اس کی تفصیل ان شاء اللہ سفر نامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۳ حلقۂ الرسالہ بمبئی کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے بمبئی کا سفر کیا۔ وہاں باندرہ میں ایک مسلم اجتماع میں تقریر کی۔ اس کے علاوہ ملاقات اور گفتگو کے کئی پروگرام ہوئے۔ یہ سفر ۷-۹ جنوری ۱۹۹۷ کو ہوا۔

۴ امریکہ کے الرسالہ حلقہ سے ای میل (الکٹرانک میل) کے ذریعہ بہت سے مسلم اور غیر مسلم حضرات کو اب الرسالہ کے مضامین خاص طور پر اسلام کے جنرل ٹاپکس پر اور عام طور پر مختصر مضامین بھیجنے کا سلسلہ دسمبر ۱۹۹۶ سے شروع کر دیا گیا ہے۔ الکٹرانک میل امریکہ میں عام بات ہو گئی ہے۔ یہ زیادہ تر لوگوں کا سورس آف انفارمیشن بنتا جا رہا ہے۔ ای میل کے ذریعہ سے جو ٹکسٹ بھیجی جاتی ہے وہ ڈائرکٹ ان لوگوں کے کمپیوٹرس میں پہنچ جاتی ہے۔ چاہے وہ کمپیوٹر دنیا کے کسی بھی کونے میں رکھا ہوا ہو۔

۵ انگریزی اخبار پاینیر کے دفتر میں ۲۰ جنوری ۱۹۹۷ کو ایک میٹنگ ہوئی جس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ اس کا موضوع بحث تھا: کیا گاندھی موجودہ ہندستان میں کامیاب ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور موضوع پر ایک تقریر کی۔ یہ تقریر ان شاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۶ ۲۲ جنوری ۱۹۹۷ کو زی ٹی وی کی ایک ٹیم اسلامی مرکز میں آئی اور اس نے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس مسئلہ سے تھا

کہ آزادی کے بعد ملک نے کیا پایا اور کیا کھویا۔ ایک سوال یہ تھا کہ آزادی سے پہلے مختلف فرقوں میں اتحاد تھا اور اب نہیں ہے اس کی کیا وجہ ہے۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ آزادی سے پہلے سارے ملک کے سامنے ایک نشانہ (انگریز کو ہٹاؤ) تھا۔ آزادی کے بعد اسی طرح قوم کے سامنے ایک مشترک اور مثبت نشانہ دینا تھا۔ مگر ہمارے لیڈر ذاتی سیاستوں میں ایسا پھنسے کہ وہ ملک کو کوئی ایسا نشانہ نہ دے سکے۔

۷ ٹی وی ادارہ کمیونی کیشن گروپ (نئی دہلی) نے ۲۴ جنوری ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک ٹی وی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ یہ انٹرویو تقریباً آدھ گھنٹہ کا تھا۔ اس کا موضوع تھا: اسلام اور مسلمان۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ موجودہ زمانہ میں مختلف ملکوں میں اسلام کے نام پر جو پرتشدد تحریکیں چل رہی ہیں ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ لوگ اپنی ذاتی سیاست کے لئے اسلام کا نام استعمال کر رہے ہیں۔ ان کے غیر اسلامی ہونے کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اسلام کا گہرا علم رکھنے والے علماء کہیں بھی ان تحریکوں میں شریک نہیں۔

۸ مسٹر محمد عاشق رضا نے علی گڑھ کے سلیمان ہال میگزین کے لئے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ موجودہ زمانہ میں مسلم نوجوانوں کے کرنے کا کام صرف ایک ہے۔ وہ سیاست کو چھوڑیں اور اپنی ساری توجہ تعلیم کے حصول میں لگا دیں۔ یہ انٹرویو ۲۱ جنوری کو ریکارڈ کیا گیا۔

۹ الحکمت فاؤنڈیشن کی طرف سے کانسٹی ٹیوشن کلب، نئی دہلی میں ۲۵ جنوری ۱۹۹۷ء (۱۵ رمضان) کو ایک اجتماع ہوا۔ اس کا موضوع تھا: روزہ کی انسانی برکتیں۔ اس اجتماع میں تعلیم یافتہ ہندو اور مسلمان بہت بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور روزہ کے موضوع پر خطاب کیا۔ یہ تقریر ان شاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۱۰ اسٹوڈینٹس اسلامک آرگنائزیشن کی طرف سے ۲۸ جنوری کو جواہر لال نہرو یونیورسٹی (نئی دہلی) میں ایک سمپوزیم ہوا۔ اس کا عنوان تعلیم اور اخلاقیات تھا۔ صدر اسلامی

مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی۔ اور اس موضوع پر خطاب کیا۔

۱۱ یکم فروری ۱۹۹۷ کو گول مارکیٹ (نئی دہلی) میں ایک افطار پارٹی تھی۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور روزہ کے موضوع پر مختصر تقریر کی۔

۱۲ یکم فروری ۱۹۹۷ کو وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس (نئی دہلی) میں بدھسٹ تنظیم کا ایک بڑا جلسہ ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور سماجی تعمیر کے لئے اخلاق کی اہمیت پر تقریر کی۔

۱۳ دسمبر ۱۹۹۶ میں بھوپال میں تبلیغی جماعت کا سالانہ اجتماع ہوا۔ اس موقع پر الرسالہ اور اس کی مطبوعات کا اسٹال لگایا گیا۔ ڈاکٹر حمید اللہ ندوی نے اطلاع دی ہے کہ یہ اسٹال بہت کامیاب رہا۔ کافی لوگ اسٹال پر آئے اور مشن کا تعارف حاصل کیا۔

۱۴ حیدرآباد میں ۳۰ نومبر سے ۸ دسمبر ۱۹۹۶ تک کتابوں کی نمائش نیشنل بک فیئر ہوئی۔ اس موقع پر الرسالہ اور اس کی مطبوعات کا اسٹال لگایا گیا۔ مولانا اکبرالدین قاسمی صاحب نے اطلاع دی ہے کہ اسٹال بہت کامیاب رہا۔ کثیر تعداد میں لوگوں نے کتابیں حاصل کیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ دینی کتب کے اسٹال جو وہاں لگے تھے ان میں ہماری کارکردگی سب سے زیادہ رہی۔ پہلی مرتبہ ہم کو اس کا علم ہوا کہ آپ کی فکر سے متفق مسلمانوں کا ایک بڑا حلقہ ہے اور یہ لوگ جماعتی چھاپ سے آزاد دین کو بے آمیز انداز میں دیکھنا چاہتے ہیں اور یہ سب کے سب تعلیم یافتہ اور باشعور لوگ ہیں۔ لوگوں نے جو غیر معمولی تاثرات بیان کئے ان میں سے ایک مسٹر قریشی کا تاثر تھا جنھوں نے کہا کہ اس بک فیئر میں جتنے بھی اسٹال ہیں ان میں ایک کتاب بھی ایسی نہیں جو آپ کی سی کتاب کی مثال بن سکے۔ ایک اور صاحب نے کہا کہ مولانا جس عرق ریزی اور دلیل و برہان سے لکھتے ہیں اس کا کوئی جواب نہیں۔

۱۵ جناب سید شفیع الدین صاحب ایم اے (انگریزی) کتاب زندگی کا انگریزی ترجمہ کر رہے ہیں۔ یہ ترجمہ تقریباً مکمل ہو گیا ہے۔ ان شاء اللہ جلد ہی اس کو شائع کیا جائے گا۔ کتاب زندگی کے انگریزی ایڈیشن کے بعد ان شاء اللہ اس کا ہندی ایڈیشن بھی شائع کیا جائے گا۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

English	Price
A Treasury of the Qur'an	75.00
The Beautiful Commands of Allah	125.00
The Beautiful Promises of Allah	175.00
The Wonderful Universe of Allah	95.00
Words of the Prophet Muhammad	75.00
Muhammad: A Prophet for All Humanity	165.00
The Life of the Prophet Muhammad	75.00
Sayings of Muhammad	75.00
Presenting the Qur'an	165.00
The Soul of the Qur'an	125.00
Indian Muslims	65.00
Islam and Modern Challenges	95.00
Islam: The Voice of Human Nature	30.00
Islam: Creator of the Modern Age	55.00
Woman Between Islam and Western Society	95.00
Woman in Islamic Shari'ah	65.00
Islam As It Is	55.00
Religion and Science	45.00
The Way to Find God	20.00
The Teachings of Islam	25.00
The Good Life	20.00
The Garden of Paradise	25.00
The Fire of Hell	25.00
Man Know Thyself	8.00
Muhammad: The Ideal Character	8.00
Tabligh Movement	40.00
Polygamy and Islam	7.00
Hijab in Islam	20.00
Concerning Divorce	7.00
An Islamic Treasury of Virtues	-

اُردو

کتاب	قیمت
تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبر انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمتِ قرآن	30/-
عظمتِ اسلام	50/-
عظمتِ صحابہ	7/-
دینِ کامل	50/-
الاسلام	40/-
ظہورِ اسلام	40/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاء اسلام	20/-
رازِ حیات	50/-
صراطِ مستقیم	40/-
خاتونِ اسلام	50/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصر حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروانِ ملت	45/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	25/-
حدیثِ رسول	25/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	-
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	20/-
راہِ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	60/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-

کتاب	قیمت
مطالعۂ سیرت	9/-
ڈائری جلد اول	-
کتاب زندگی	40/-
انوارِ حکمت	-
اقوالِ حکمت	20/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدیدِ دین	20/-
عقلیات اسلام	30/-
مذہب اور سائنس	-
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	8/-
اسلام دین فطرت	7/-
تعمیرِ ملت	6/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارفِ اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	7/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحادِ ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	10/-
حقیقت کی تلاش	7/-
پیغمبر اسلام	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	7/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	5/-
دینی تعلیم	7/-

کتاب	قیمت
حیاتِ طیبہ	7/-
باغِ جنت	7/-
نارِ جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامین اسلام	30/-
تعددِ ازدواج	3/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صومِ رمضان	7/-
علمِ کلام	9/-
اسلام کا تعارف	4/-
علماء اور دورِ جدید	8/-
سیرتِ رسول	
ہندستان آزادی کے بعد	3/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	8/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	7/-
الاسلام یتحدی	85/-

ہندی

کتاب	قیمت
سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
سچائی کی کھوج	-
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	8/-
پیغمبر اسلام کے مہان ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بہو پتنی واد اور اسلام	3/-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب	

AL-RISAL BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013, Tel 4611128, Fax 4697333

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم ازکم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

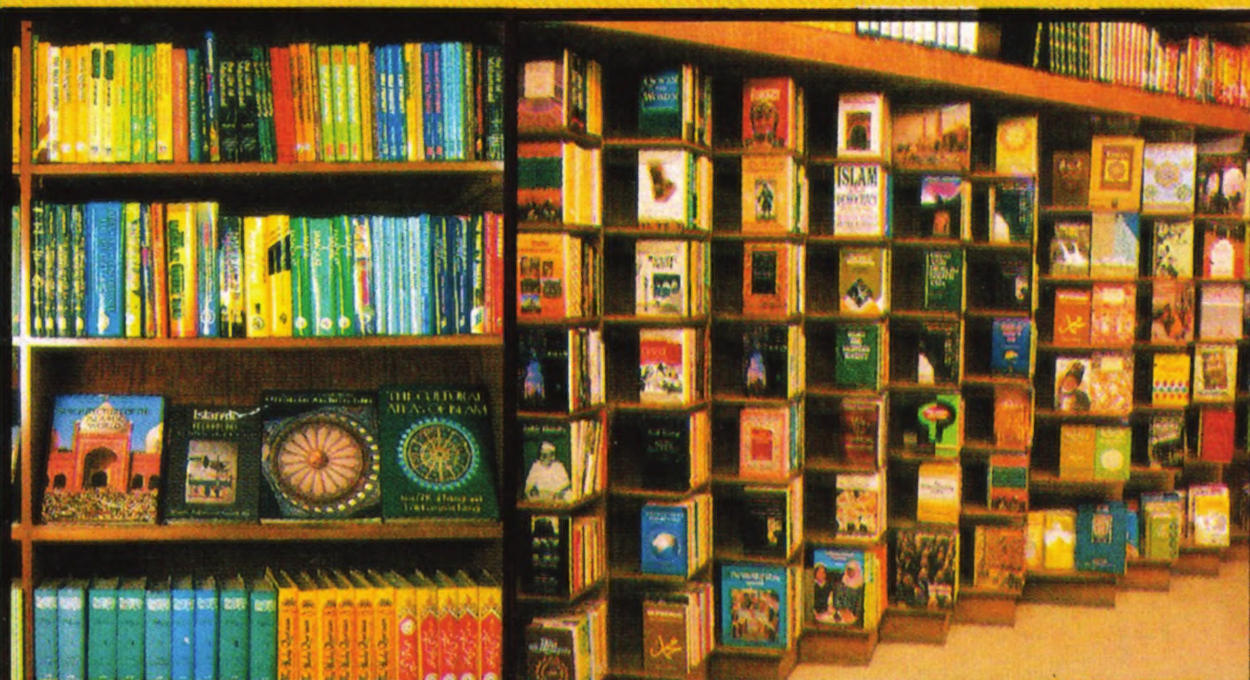
۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs. 90	ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs. 170	دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs. 250	تین سال	$50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs. 400	پانچ سال	$80 / £40	$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)	$100 / £50	

Finest collection of books on Islam







RNI 28822/76 • U(SE) 12/97
Delhi Postal Regd. No. DL/11154/97

AL-RISALA BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, Near DESU, New Delhi-110 013
Tel. 4611128 Fax 4697333